# "ایک شاعر کا انجام"

از

حضرت نیاز فتحپوری

۱۹۱۳ء

باہتمام نذیر احمد (علیگ)

مساوات پریس آرہ سے شائع ہوا

بار اول ۱۰۰۰ جلد

قیمت فی جلد مع محصول ڈاک ۱۲؍

"رشحات نیاز" حضرت نیاز فتحپوری کا وجود اس سے مستغنی ہے کہ اُس کی
معرفی ملک سے کرائی جائے اُن کے مضامین نثر و نظم جس وقعت و پسندیدگی کی نگاہ
دیکھے گئے ہیں اُس کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ اہتمام کیا گیا ہے کہ تمام نظمیں، عام
اس سے کہ وہ شائع ہو چکی ہوں یا نہیں اک کتابی صورت میں ترتیب دی جائیں یہ مجموعہ
نہ صرف قومی نظموں کا ہوگا، بلکہ ہر رنگ کا کلام اس میں نظر آئے گا۔ یہ مجموعہ زیر ترتیب
ہے اور جلد پبلک کے ملاحظہ کیلئے پیش ہوگا جسکی قیمت تخمیناً ایک روپیہ زائد نہ ہوگی۔

"جذبات بھاشا" حضرت نیاز فتحپوری کی تازہ تصنیف جو زیر طبع ہے۔ دیباچہ
میں نفس شاعری پر ایک بسیط بحث کی گئی ہے اور اُس کے بعد برج بھاشا شاعری کے
اساتذۂ قدیم کے کلام کا بہترین اقتباس درج ہے اور اُس کے محاسن شعری، جذبات
و تخیلات، انداز بیان و ترکیب نظم پر نہایت دلکش انداز میں تنقید کی گئی ہے۔
اس زبان کی شاعری پر ایسا تبصرہ، اُردو ادب میں بالکل جدید اضافہ ہے قیمت ۱ار
جو حضرات قبل سے درخواست خریداری بھیج دیں گے اُن کے ساتھ پچیس فیصدی
کی رعایت ہوگی درخواست اس پتہ سے ہو۔

المعلن عارف حسن عارف ہنسوہ۔ ضلع فتحپور

# پہلے یہ غلطیاں درست فرمالیجے

| صفحہ | سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|
| گذارش | ۴ | ،ول | ناول |
| ۱ | ۱۰ | چہاڑی | جھاڑی |
| 〃 | ۱۱ | مجروچ | مجروح |
| ۵ | ۱۴ | دے رہی | دے رہی ہوگی |
| 〃 | ۱۸ | تیرا جر | تیرا جبر |
| ۶ | ۱ | چاہیئے | + |
| 〃 | ۱۰ | ہرج | حرج |
| 〃 | ۱۲ | چان سہے | جان جائے |
| ۷ | ۳ | ہیشرہ | ہمیشہ |
| ۸ | ۱۶ | محروج | ممزوج |
| ۱۰ | ۴ | پھولوں | پھولوں پر |
| 〃 | ۱۳ | مجھکو | تجھکو |
| ۱۱ | ۹ | متحیر العقول | محیر العقول |
| 〃 | ۱۱ | بیٹھا دیا | بٹھا دیا |
| ۱۴ | ۴ | ؟ | پڑا |
| ۱۵ | ۱۰ | مخساست | مخمصات |

| صفحہ | سطر | غلط | صحیح |
| --- | --- | --- | --- |
| ۱۸ | ۱ | توہنت | نزہت |
| ۱۹ | ۱۲ | لیا ہوا | لیتا ہوا |
| ۲۱ | ۱۷ | پہنچنا | پہنچانا |
| ۳۴ | ۳ | کہ مجھے | مجھے |
| ۳۵ | ۴ | کڑکر کے | کڑا کر کے |
| ۳۷ | ۱۲ | سمجھی تھی | سمجھتی تھی |
| ۳۸ | ۱۷ | ملے آتا | ملنے آتا |
| ۳۸ | ۱۳ | کیفیت | کیف |
| // | ۱۹ | ڈرتا | ڈرتا تھا |
| ۴۲ | ۱۳ | مجوّل | محمول |
| ۴۳ | ۹ | لقاب | نقاب |
| ۵۰ | ۱۲ | ہے | ہو |
| ۵۴ | ۱۷ | مستقل | مشتعل |
| ۶۴ | ۱ | بڑا | بُرا |
| ۶۵ | ۱۳ | تریاکے | تڑپاکے |
| ۷۵ | ۵ | مسمور | مسحور |
| // | ۱۵ | نفرشت | سرشت |

# ڈیڈی کیشن

"اقتضائے محبت تو یہ تھا، کہ میں ان اوراق کو کسی معزز وجود کے ساتھ منسوب کرتا، اور اُسی کے پُرشوکت نام کو ان کا عنوان بناتا، لیکن میں ڈرتا ہوں، کہ کہیں یہ جنونِ خود فروشی، یہ ہذیانِ محبت، دولت کے نزدیک خراشِ سامعہ نہ ثابت ہو؟ اس لئے

## اے دلِ دیوانہ

تیرے نالہائے شکستہ، تیرے پارہائے آہ، تیرے ہی سازِ مجبوری کے سامنے پیش کرتا ہوں - خدا کرے یہ عرضِ نغمہ تیری ہستیِ متلاطم کے حضور میں خجلتِ کاوش نہ ثابت ہو -

"تو بھی کہہ دے کہ ادا سے آمین"

نیاز

# گذارش

اس مجموعۂ اوراق کو جسے اب بھی میں پریشاں ہی سمجھتا ہوں، اُس نگاہ سے نہ دیکھیے گا جس نگاہ سے آپ نے اس وقت تک دیگر قصص و حکایات کو ملاحظہ فرمایا ہے۔ یہ نہ تو مذاقِ چٹپٹی رکھنے کا مدعی ہے کہ قافیہ پیمائی آپ تلاش کریں، اور نہ موجودہ ناول طرازی کا ہم آہنگ، کہ ضلع جگت اور غزلیات کی آپ کو جستجو ہو۔ نہ آپ اس میں اشعار پائیں گے اور نہ عامیانہ زبان۔ مگر ہاں، اس میں کلام نہیں کہ اگر اس فسانۂ درد کو آپ نے اک نگاہ دردمند اور دلِ مبتلا کے معیار سے دیکھا، تو میری وارفتہ نوائی کی داد ضرور مل جائے گی۔ ایک بات کا تسلسل بھی دوسرے باب سے ذرا کم پائیے گا؛ لیکن معاف فرمائیے، پروردۂ اشک ہوں، مجھے تو موتی کچھ بکھرے ہوئے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

غالباً، دورانِ مطالعہ میں، نویے ترکیب، لطافتِ بیان، پاکیزگیِ تخیلات آپ ہر جگہ پائیں گے، اور یہی میرا ذوقِ حدیث ہے۔ اگر جناب کی نگاہ میں یہ آشفتہ بیانی محمود سمجھی گئی، تو میں اس کا دوسرا حصہ بھی پیش کر سکوں گا، ورنہ میری ہی پریشانیِ حسرات کیا کم ہوگی۔

خادم

نیاز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# ایک شاعر کا انجام

## (۱)

ایسٹ روڈ نمبر ۲۴ ساحل منزل میں پوسٹ مین دس بجے دن کو یہ خط دیتا ہوا چلا جاتا ہے۔

۱۷ فروری ۱۹۱۲ء

میری زبیدہ

اپنی حمیدہ سے اب تو ہم آغوش ہو لو۔ کیا میرے جنازہ پر بھی کوئی ماتم آنسو بہانے والا نہ ہوگا؟ گر خدا معلوم جس وقت یہ تحریر تمہارے ہاتھوں تک پہنچے میرا کیا حشر ہو۔ باریک ریشم کے دوپٹہ کو خاردار جھاڑی میں الجھاؤ اور پھر کھینچ کے دیکھو۔ آہ! میری روح اس سے زیادہ مجروح، اس سے بہت زیادہ پاش پاش ہے۔

وہ ولولے، وہ حوصلے، آہ! وہ امنگیں [illegible] جن کو میں سمجھتی تھی کہ صرف [illegible] کے لئے ہیں، ایک کہاں ہیں؟

ساتھ ان کا [illegible] جس کر میری [illegible] آمیزش کی [illegible]

[illegible]

پر غور کرو اور پھر [illegible] اس کا اندازہ۔ غالباً تم اب تک [illegible] کہ جان دے دینا [illegible] ہے۔ اس وقت تک تم کو اطلاع نہیں دی؟ ہاں نہیں دی۔ مگر کیا تم سمجھتی ہو کہ میرے تو اس وقت [illegible] اپنے [illegible] اور [illegible]

جو جان سے تنگ آ کر، ساری دنیا سے متنفر ہو کر کبھی کبھی تنہائی میں، اپنے عزمِ آخر کی
ہمت افزائی پر اپنی آنکھوں کے خونی تبسم کے ساتھ وہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور یہ "
گنگنا رہا ہو، اور سرمستِ آلام ہو کر، دنیا و مافیہا کو بھلا بیٹھا ہو۔

یہ تحریر، اس کو بھی میرے حرکاتِ مذبوحی کی تپش آخری سمجھو۔ ورنہ مجھے اپنے اوپر
اس قدر اختیار کہاں۔

کل محلہ میں قریب ہی اک بارات آئی، میرے کانوں تک بھی یہ خبر کسی طرح پہنچ گئی کہ
دولہا (آہ، یہ لفظ میرے لئے کس درجہ ہولناک ہے) گریجویٹ، اور ادبی دنیا میں بڑا
ذی اثر نثار اور شاعر مانا جاتا ہے۔ ہائے کیا بتاؤں، کیسا دل تڑپ کر رہ گیا، کہ کیونکر اس کو
چھین لوں، کیونکہ اس کو اپنا بنا لوں۔ یہ بات لکھنے کی نہ تھی، مگر تم پر ظاہر کر دی کہ تمہیں
میری بیکس زندگی کی حقیقی حالت پر دل دکھانے کا وسیع ذریعہ ہاتھ آ جائے۔

آج کم و بیش تیس دن ہوئے، جب مجھ سے اس نامساعد مناکحت کی تقریب میں
قبول کیا کے دو لفظ حاصل کئے گئے، لیکن پیاری! نادیدہ تجھے یہ خبر تھی کہ اس مختصر
جملہ میں میرے ارمانوں کو برباد کرنے، میری تمام حسرتوں کو خاک میں ملانے کی کافی قابلیت
موجود تھی۔

وہ وقت، جس کی آرزو میں میری زندگی کے سترہ سال ایک ایک دن کر کے
گذر گئے تھے وہ ساعت جس کا تخیل مجھے پہروں کالج میں مست رکھتا، وہ گھڑی جس کی تمنا
میں آنکھوں تمنا میں، دل میں خوابیدہ تھیں، آئی۔ شب ماہ ٹھیک نصف ہو کر گویا میری
قسمت کا نتیجہ آخر دیکھنے کو ٹھہر گئی تھی۔ اور چاند اپنے سارے وجود کے ساتھ بیتحاشہ
دیکھنے کے لئے مجھ پر جھکا پڑتا تھا۔ بارہ کے گھنٹے نے وہ چیز میرے سامنے لا کر کھڑی

کردی، جس کی پذیرائی کے لئے میرا دھڑکتا ہوا دل، میری پر ہیجان روح کا جوش وخروش، آمادہ و منتظر تھا۔ ابھی میں اپنے ہنگامۂ ہستی کے تماشہ میں مصروف تھی کہ اس مرغ زریں سے یہ آواز آئی :۔

"بارہ بجا ٹیم (ٹائم) ہوگیا، جرا (ذرا) مُنہ تو ......"

نفخ صور شاید اس درجہ قیامت خیز نہ ہوگا، جیسا حشر انگیز یہ جملہ میرے حق میں ثابت ہوا۔ اس مہلک و جاں گسل ٹیم نے فیصلۂ آخر سُنا دیا۔ وہ پُر لحن صدا برق پاش ہو کر صبر دل و دماغ کو چھلنی کرتی ہوئی چل دی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ غیظ و غضب کی وہ انتہائی حد، جہاں تک پہنچنے کا مجھے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا، میں نے پالی۔ پوری قوت کے ساتھ مدافعانہ کوششیں عمل میں لائی گئیں، اور نہایت جرأت کے ساتھ میں نے۔ نفرت ظاہر کی۔

اک تاریک سا کمرہ میرا زنداں ہے، جہاں جملہ تکالیف میرے لئے مہیا ہیں۔ کیا ایسا ایجاب و قبول، منطبقات و تمثیلات ازدواج میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ جائداد کی مجھے پرواہ نہیں، مگر میں تو اپنی روح کی اذیت سے گھبراتی ہوں۔

تمہاری حزیں و ناکام

حمیدہ

حامد منزل، ۱۹ر فروری ۱۹۱۲ء

پیاری حمیدہ

آہ، یہ تمہاری تحریر، یہ تمہارے گورے گورے نازک ہاتھوں کا لکھا ہوا مستطیل نیلگوں لفافہ۔ جس وقت زعفران ڈاک لائی اور اس تحریر پر نگاہ پڑی، ہائے وہ سوادِ خط،

جس کو میں نے برسوں رضیہ ہال میں نقش کیا تھا، اور جس کے دیکھنے کو مدت سے آنکھیں ترس رہی تھیں، آج پھر اپنے اسی حسن سنبلیں کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ اور تمام اگلی صحبتیں جن کی یادیں اپنے گوشۂ دل میں دفن کر چکی تھی، اپنے ساتھ لیتا آیا! میں تم کو نہ لکھوں گی کہ زعفران اس وقت میری شوخانہ حرکات پر کس قدر ہنسی۔

تاثرات کا ہجوم، جن کو میں تم تک صرف اک طویل آہ کی صورت میں پہنچا سکتی ہوں، میری عصبیت سے فائدہ اٹھا کر خدا جانے کہاں پھینک آیا۔ وہ کالج کا لیکچر روم، جہاں تم میرے پاس بیٹھی ہوئی، رولڈ گولڈ کی شکاری کمانی والی عینک، اپنی ابھری ہوئی آنکھوں پر لگائے ہوئے، بورڈ کو اپنے متاملانہ نگاہ سے دیکھ رہی ہو، اور ہاتھ میں پنسل لئے ہوئے خدا معلوم لاعبانہ انداز سے یا تسلسل خیال قائم رکھنے کے لئے آگے میز پر کھٹ کھٹ کر رہی ہو، میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ وہ تمہارا مختصر سا آراستہ کمرہ نگاہوں کے سامنے ہے، جہاں مس روز تم کو موسیقی پر لیکچر دے رہی ہیں، اور تم پیانوں کے سفید پردوں پر، اپنی لانبی نازک، لچکدار انگلیاں رکھے ہوئے گنگنا گنگنا کے رہ جاتی ہو کہ ذرا موقعہ ملے، تو میں پیانوں کو فریاد میں لاؤں

ہائے، وہ پارک میں فرصت کے اوقات، جب چاندنی راتوں میں، فوارہ کے پاس گھاس پر بیٹھی ہوئی، اپنی زندگی کی خوش آیند راتوں پر بحث کر رہی ہو۔ آہ، یہ یاد سخت جانگزا ہے، جب تمہارے اس خیال کو موجودہ حالت سے منطبق کر کے دیکھتی ہوں، تو بے اختیار چیخ مارنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسی شگفتہ ہستی، ایسا شاعرانہ وجود یوں افسردہ اور بے کیف انجام دیکھے۔

پیاری حمیدہ، تمہاری حالت معلوم کر کے، میں نے نہ صرف تم پر دل دکھایا،

بنانے کا اہل ایک گھنٹہ رو چکی ہوں۔

تمہارا وہ جملہ اب تک میرے قلب میں مرتسم ہے کہ میں تو اک ایسی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں، جس میں موسیقی ہی موسیقی ہو۔ سچی محبت والا شاعر میرا ہمدم ہو، اور میں فرطِ عشق میں اپنے پرترنم آہ سے اس کی پرصداقت الفت کا جواب دیا کروں۔ وہ تمہارا پرکیف اندازِ گفتگو، وہ مست طرزِ خرام، وہ کشیدہ قامتی، جس پر کالج بھر رشک کرتا تھا اور تم خود اس کا احساس کر کے کبھی کبھی جوش میں آ کر اک ٹھنڈی سانس لیکر کہہ اٹھا کرتی تھیں کہ اب تو مجھے اپنے بدن سے عطرِ عروس کی خوشبو آتی ہے، پیشِ نظر ہے۔ تم اک پھول تھیں جس کے لئے اک ذی حس دماغ کی ضرورت تھی۔ تم اک نغمہ تھیں، جس سے متاثر ہونے کے لئے اک پرسوز و گداز قلب درکار تھا۔ اُف کیسے ظالم ہیں وہ ہاتھ، جنھوں نے تم پر ظلم توڑے، محض اس قصور پر کہ تم حسین ہو۔ تم کو اذیتیں پہنچائیں صرف اس خطا پر کہ تم تعلیم یافتہ ہو۔

حمیدہ، میری ہمدردی اور دلسوزی قبول کرو، اور اس امر کا یقین کہ میرا قلب تمہارے ساتھ پاش پاش ہونے کو آمادہ ہے۔

آہ، زبیدہ بیگم کی روح آج دعائیں دے رہی ہوگی اُن عقارب (اقارب) کو، جنھوں نے تم کو ایسی پُرمست زندگی سے آشنا کیا۔ وہ فہیم خاتون جس کی کوششوں نے تم کو نگینہ بنایا اس خیال سے کہ کسی انگوٹھی کی رونق بڑھاؤ، آج تہِ زمین یہ دیکھ کر کس درجہ مسرور ہوگی کہ وہی الماس، جس کی آب و تاب اک شاہانہ ہاتھ ڈھونڈھتی تھی، یوں آلودۂ خاک ہے۔ اے عفیفہ، صبر کر، صبر، تیرا اجر تیرے ساتھ ہے۔ یہ زندگی کی چند ساعتیں، جن میں تو اپنے جگر کے ٹکڑے (حمیدہ) کو اک شاداب و خرم و

کامحل دیکھنا چاہئے چاہتی تھی، کسی نہ کسی طرح گذر ہی جائیں گی اور وہ ابدی مسرت جس کی ابتدا تو نے اس قدر جلد چاہی تھی، کبھی نہ کبھی مل ہی رہے گی۔

وہ مارچ کا منحوس مہینہ، وہ نو بجے کا نامساعد وقت، جب تم کو تمہاری اکیلی ہمدرد اور قابل ماں کی ناگہاں موت کی خبر پہنچی، تمہارے آلام زندگی کا عنوان تھا، اور میں اسی وقت کھٹکی تھی کہ دیکھئے تمہارا چچا، وہ مجسم اور سچا شائی لاک، تمہارا ولی بنکر، کیا آفتیں تم پر توڑتا ہے، اور آخر کار وہی خوف سامنے آ گیا۔ وہ جاہل اور صاہل وجود تمہارا ہمدم بنے! واللہ یقین کرنے سے جی گھبراتا ہے۔ یہ دلخراش فسانہ، پیاری حمیدہ، کیا میرا ہی دل دکھانے کے لئے تم نے اپنے صحیفۂ زندگی میں لکھا ہوا چھپا رکھا تھا۔

پیاری، جان دیدینا تو ہر وقت اختیار میں ہے، لیکن اگر تم اپنی زندگی ضائع کرکے کسی اور کی ہستی کو بھی مغموم بنا جاؤ تو کچھ حرج نہیں، کیونکہ یہ بھی اک نوع کا عوض لینا ہے کہ "ہم گئے تو گئے، تمہارا جی بھی تو دکھا گئے" مگر جب یہ نہیں، تو پھر علاوہ اخلاقی کمزوری کے سفیہانہ امر بھی ہے کہ جان کی جان جائے، اور عدو الگ بغلیں بجائے۔ لڑو اور لڑکے جان دو، اگر دینا ہے۔

جہاں تمہاری تحریر کے ہر ہر لفظ نے میرے دل آزاری کا سامان مہیا کیا، وہاں یہ معلوم کرکے مجھے مسرت بھی ہوئی کہ تم نے اپنی مدافعانہ کوششوں کو کامیاب دیکھا۔ مسٹر حامد کل شام کو لکھنؤ سے واپس آ جائیں گے، ان سے مشورہ کرکے پرسوں دوسری تحریر روانہ کروں گی، مطمئن رہو۔ زبیدہ اب تمہاری طرف سے غافل نہیں رہ سکتی تمام ممکن کوششیں، جملہ امکانی تدابیر جو اس کی قدرت میں ہیں، اٹھا نہ رکھی جائیں گی۔ افسوس ہے کہ تم نے بعد از وقت اطلاع دی، ورنہ تمہارے غم میں، تمہارے دردمیں

اپنا جی کھلانا فرض سمجھتی ہوں۔ خدا کرے جس وقت یہ تحریر تم تک پہنچے تم مطمئن حالت میں ہو اور تمہارے قلب سے غم کا استیلا کم ہو گیا ہو۔

ہمیشہ
تمہاری [redacted]
زبیدہ

(۲)

"دنیا، امیدوں کی جولانگاہ، فانوسِ خیال بنی ہوئی، اپنی بوقلمونی اور تغیر الالوان ہستی کے تماشے دکھا دکھا کے اسی طرح اک عالم کو مربوطِ مسرت و حیات بنائے ہوئے ہے۔ شام کشائش کار کا غیر مرئی جلوہ صبح آئندہ کے لئے مخصوص کرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ ہر صبح اپنے جامِ زریں کے رقص سے ہم کو فراموشکاری کا سبق دیتی ہوئی، سلسلۂ تمنا میں اک نئی کڑی بڑھا کے شام پر ٹالتی ہوئی سفر کر جاتی ہے۔ یہ کشمکش یہ ہماری ہستی منقضی، صرف صبح و مسا ہو رہی ہے۔ مگر اُف ری، ہماری وارفتگی! کہ اس مایوس نظارگی میں بھی لطفِ تماشہ کی جستجو ہے۔

پھول کھلے، مرجھا گئے۔ نہالانِ گلشن سبز پوش ہو ہو کر خشک ہو گئے۔ افسوس ہوا تو اس اندازے سے کہ جلوۂ دیگر کی تکلیفِ آرزو اٹھانا پڑی۔

یہ ہماری زندگی کا اک جزو تھا جو ختم ہو گیا؛ چاہئے تھا کہ اک جزو آرزو بھی اسی کے ساتھ دفن ہو جاتا، مگر آہ، یہ نہال کٹتا ہے بڑھنے کے لئے، گھٹتا ہے قوی ہونے کے لئے......"

غرضکہ اسی نوع کے خشک انداز تکلم سے انہیں نے عرصہ تک کوشش کی کہ افضال کی مایوسی، جس کے نسبت قوی گمان یہی تھا کہ اُس کے جذبات لطیفہ کی بجا آزادی

سے پیدا ہوئی ہے۔ فلسفۂ تصوف کے ہزار مسائل و اصول کے زیر اثر اگر کم ہو جائے
مگر میری اس طلاقتِ لسانی کے جواب میں، اُس کا نہایت لاپرواہی سے، اک خفیف سی
جنبش گردن کے ساتھ، ایک پتلے بید سے فرشِ زمین پر بہت سے چھوٹے چھوٹے
مثلث غیر متساوی الاضلاع بناتے ہوئے، صرف اتنا کہہ دینا کہ "جی ہاں درست ہے"
میرے لئے اک ایسی صریح ملامت تھی، جس پر مجھ کو ندامت کے ساتھ کچھ غصہ بھی آ گیا۔

غالباً اُس نے بالکل سُننے کی کوشش نہیں کی، کیونکہ یہ اُس کی خصوصیات میں
سے تھا کہ جب وہ اپنے داعیات کے خلاف، کوئی بات سُنتا تو اُس کی وارفتگی اور زیادہ
بڑھ جاتی، اور بلا اخذِ مفہوم، نہایت غیر متاثر پیرایہ میں، اگر کوئی اجنبی ہوا، تو اک خفیف
سے مصنوعی تبسم کے ساتھ، اور اگر کوئی بے تکلف دوست ہوا تو نہایت سنجیدگی
سے "جی ہاں" کہہ دیتا۔

**افضال** فطرتاً ہر بات پر نہایت زور سے قہقہہ لگانے والا، تفریح و دلچسپی
کی ہر گھڑی کو نہایت پر انہماک ذوق سے کاٹنے والا تھا۔ اُس نے اپنے کورس کی
کتابیں شاید اس قدر دلچسپی کے ساتھ کبھی نہیں پڑھیں، جس شوق کے ساتھ وہ اک
راستہ پر پڑے ہوئے کاغذ کا، جس پر (To night) آج کی شب لکھا ہو، مطالعہ
کرتا۔ مجھے یاد نہیں کہ اُس نے کوئی رات ایسی گذاری ہو، جس کی صبح کو اُس نے اک پُر مسرت
انفعال کے ساتھ، طویل آہ و [illegible] مجھ سے یہ نہ کہا ہو کہ "رات تو ایک عجیب
پُر لطف کرب میں گذری"۔

افضال، ہر تاثر سے تڑپ جانے والا افضال، ہر حسین شے پر مٹنے کے لئے
آمادہ و منتظر افضال کہ پہلے بھی جیسا شاعر اور فکراً منفی تھا، لیکن میری کامل دو ماہ

کی صحبت کے بعد اُس کا مذاق طبیعت نہایت ہی سُرعت کے ساتھ ہلاکت کے جانب متحرک نظر آتا تھا، وہ میر کے اس شعر پر ؎

اب حالِ دل ہے اُن کے دلخواہ     کیا پوچھتے ہو الحمد للہ

گھنٹوں سر دھنا کرتا۔

جب وہ رات کو، نورِ ماہ میں، اپنے نشۂ حیات میں مستغرق، گریبان کھولے ہوئے، کبھی برہنہ سر، اور کبھی ترکی ٹوپی پیشانی سے ۴-۶ انگل پیچھے رکھے ہوئے، جس سے، اُس کے گھونگر والے بالوں کی دو چار لٹیں ضرور پیشانی پر پڑ جائیں، امین آباد پارک میں ٹہلا کرتا، تو بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ شعر و موسیقی کے عمانِ ضیا کی کوئی مچھلی ہے، جو ادھر اُدھر تیر رہی ہے۔ ہر چیز کو جس شاعرانہ نزاکت نگاہ سے وہ دیکھتا، شاید مشکل سے اُس کی نظیر مل سکے۔ ایک دفعہ ۲۵ دسمبر کو، یہ یاد نہیں کہ اسٹیشن کیوں گیا تھا، مگر میں بھی ساتھ تھا اُس کی وارفتگی کا کیا ٹھیک تھا، اسٹیشن کو غیر معمولی انداز سے آراستہ دیکھکر چونک پڑا "ہائیں! یہ کیا ہے؟" مگر مجھکو متبسم دیکھ کے، وہ ہوش میں آگیا اور "لاحول ولا قوۃ" کہ کے، اور کچھ شرما کے پھر کھو سا گیا۔ ڈاک گاڑی کی جواب قریب آگئی تھی، دیکھکر تڑپ گیا، منقش کے طرّے، پھولوں کے ہار، انجن کو پری بنائے ہوئے تھے۔ افضال کے لئے تو اسٹیشن کی دیواروں کے رنگین اشتہار ہی بے چینی پیدا کردینے کے لئے کافی تھے چہ جائیکہ انجن کا عروس کی طرح سجا ہوا سامنے سے گذرنا، جس کو دیکھکر مجھ سا بے کیف آدمی بھی مسرور ہوا۔ غرضکہ وہ بالکل بے اختیار ہوگیا اور کہنے لگا "دیکھا آپ نے؟" خدا معلوم وہ مجھکو کیوں اس قدر عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ریل کا سفر، اگر مَیں ریل کے وجہ سے کبھی دلچسپ

ہوسکتا ہے، تو وہ آج ہی کا دن ہے" پھر ذرا ٹھہر کے "نہ چلئے نہ پھر ایک ہی اسٹیشن ہی ہے" میں نے بمشکل سے ہنسی ضبط کی اور قصداً نہایت بد مذاقی کا جواب دیا کہ "بھئی، چلنے کو تو چلیں، لیکن ان پھولوں پر کون بیٹھنے دے گا؟" نہایت کبیدگی کے ساتھ اس نے جواب دیا "آہ! آپ کو یوں کہنا چاہئے کہ انجن پر کون بیٹھنے دے گا، کیونکہ پھولوں کو تو کوئی بیٹھتا نہیں، بلکہ اُن کی معیت چاہتا ہے، خیر انجن نہ سہی گاڑی ہی سہی، جس کا تعلق اُس انجن سے ہے، کم از کم اگلے اسٹیشن پر اُتر کے یا نگاہِ نمناک، اک اندوہ حسرت کے ساتھ! اس کے انداز حسرت سے دلگیر تو ہو جائیں گے۔ یہاں رسم مشایعت ادا ہو جائے گی اور وہاں رسم وداع"

وہ اپنے جذبات سے زیادہ ترعملی حظ اُٹھانے کا بہت شائق تھا، اور چاہتا کہ ہر حسین شے پر وہ یکلخت مستولی ہو جائے۔ مَیں اُس کی اس ہلاک قریب تمنائے فطرت سے نہایت خائف رہتا تھا، اور آہ، آج وہی خوف پیش نظر تھا، جب مَیں نے اُس کو بہت زیادہ خلاف معمول غمگین دیکھکر تقریر کی تھی اور اُس کے جواب میں اک نہایت مایوسانہ لہجہ میں "جی ہاں، درست" کہ کے مجھکو سخت متالم بنا دیا تھا۔

**کیننگ کالج** لکھنؤ کا متعلم، چاہئے تھا کہ اپنی زندگی کا زیادہ حصہ ملبوسات کی فکر میں گذارتا، نہ سہی روز کم از کم دوسرے تیسرے تو ضرور کالر اور ٹائی بدل دیتا، مگر آہ، اُس کو تو تباہ ہونا تھا۔ وہی باریک تنزیب کا سفید کُرتا جو ہمیشہ اُس کے جسم پر زیب نظر آتا، وہی کھلا ہوا گریبان، وہی معمولی سی عینک، وہی اُلجھے ہوئے بالوں کا پیشانی پر پڑا رہنا۔ ہائے یہی سادگی، اس کے گورے رنگ، اُس کے عنفوان شباب، اُس کی بڑی بڑی آنکھوں، اُس کے دلکش کتابی چہرہ کے لئے

نظر بد ہو کر رہ گئی۔ مجھ کو کالج کے دوسرے لڑکوں سے دوران گفتگو میں "As beautiful as Afzal" (ایسا حسین جیسا افضال) سُنکر اتنا ڈر نہ لگتا تھا، جتنا خوف مجھ کو اس نوجوان شاعر کی وارفتہ وضعی سے تھا۔

وہ پان بہت کھاتا، اور میں اُس کو اس حیلہ سے منع کرتا کہ یہ کچھ اچھی چیز نہیں، حالانکہ اصل وجہ تو یہ تھی کہ میں پان کھانے کے بعد اُس کے رنگین لبوں کی سُرخی کو دیکھ دیکھ کر خائف رہتا کہ کہیں یہ شعلہ کسی دن اُس کی ہستی کو جلا کے خاک نہ کر دے۔ وہ سُرمے سے متنفر تھا، مگر میں یہ چاہتا تھا کہ وہ استعمال کرے، کیونکہ اُس کی آنکھیں یوں تو اور بھی مسترحم، اور عاشقانہ کیف کا محل نظر آئیں۔

میں نے جب اپنی تقریر کو اُس متحیر العقول وجود انسانی کے لئے اس قدر غیر مؤثر پایا، تو میں نے پُرخشم انداز میں اُس کا داہنا ہاتھ اک فوری جھٹکے کے ساتھ گھسیٹا، اور برآمدہ میں اک کرسی پر لے جا کر اُسے بٹھا دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اطمینان سے بیٹھ کے کھُلم کھُلا اُس کے جذبات کی حقارت کروں گا، کیونکہ میں اپنے تئیں اُس کی نسبت بزرگانہ نگاہ سے دیکھتا تھا، مگر اُس کی حالت دیکھ کر میرے ارادے مضمحل، اور بہیمہ عزائم شکستہ ہو گئے۔ مجھکو اُس کے ساتھ غیر معمولی اُلفت تھی، بعض دفعہ تو میں یہ خیال کرنے لگتا تھا کہ میرا اُس کو اس نوع کے تخیلات سے روکنا کہیں اس بنا پر تو نہیں کہ میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ وہ کسی کو چاہے یا اُس کو اور کوئی چاہے بہر حال وہ خود غرضی ہو یا خیر خواہی، میں اُس کے انجام مبہم سے کانپا جاتا تھا، اور اسی بنا پر میں نے آج اُس کے زندگی کا اک نیا ورق بدلنے کا ارادہ کیا تھا، مگر آہ، جو کسی کو مغموم بھی نہ دیکھ سکے وہ اشکبار کیونکر دیکھ سکتا ہے۔ سپید آنسو، اُس کے رخساروں سے جلدی جلدی

ڈھلک کر اکرتے کے دامن کو بھگو رہے تھے۔ کان سُرخ تھے اور چونکہ وہ اس گریۂ بے اختیار کو نہایت جبر کے ساتھ ضبط کر رہا تھا، اس لئے برآمدہ میں تو صرف اُس کی کرسی اور اُس کا بدن کانپ رہا تھا، مگر میں تو اس وقت ساری کائنات کو مرتعش دیکھ رہا تھا۔

اک فوری خیال اُس کو تسلّی و تشفی دینے کا پیدا ہوا، ارادہ کیا کہ اُس کے سارے آنسو اپنے رومال میں جمع کر لوں اور خود بھی اُس سے لپٹ کے رونے لگوں، مگر میں نے اپنے میں اس قدر جسارت بھی نہیں پائی، اور اُٹھ کر۔ زینوں پر زور سے قدم مار کر کہ اُس کو میرے چلے جانے اور اپنی تنہائی کا بالکل یقین آجائے اور خوب جی کھول کر رو لے، نیچے اُتر گیا۔ شام، اور وہ بھی اودھ میں لکھنؤ اور بالتخصیص امین آباد پارک کی شام بہم بہار مع اپنی تمام شگفتگیوں، اور دلاویزیوں کے نشۂ مسرت میں مصروف تھا، اور اُس بلد الموسیقی میں اک غیر محسوس نغمہ ہر در و دیوار سے سرودِ بہار کا پاسخگذار نظر آتا تھا۔ فرشِ سبزہ پر، فوّارہ کے چاروں طرف، بنچوں پر، برآمدے میں، سڑکوں پر آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ گو یہ روز کی معمولی باتیں تھیں، لیکن آج تو جہاں نگاہ پڑتی تھی جم کے رہ جاتی تھی، اس لئے اب میری سمجھ میں کچھ کچھ آچلا کہ شام کی تفریح، شاید کوئی پُرلطف مشغلہ ہو گا۔ یہی سوچتا سوچتا میں بجلی کے لمپ کے پاس پہنچ گیا، جس کی شعاعیں فوّارہ کے قطراتِ مسلسل پر ضیا افگن ہو رہی تھیں، اور حوض ان آبدار موتیوں کو اپنے دامن میں رُول رُول کے جمع کر رہا تھا۔ پھول والی اک پتلی لکڑی میں گندھے ہوئے ہار لٹکائے ہوئے، اور ایک ٹوکری میں کچھ کھلے ہوئے پھول، اور کلیاں لئے ہوئے بیٹھی تھی۔ اُس نے مجھکو دیکھکر فوراً ہار نکالے، کیونکہ ۴-۶ ہار روزانہ افضال کے لئے مجھکو لے جانا پڑتے تھے۔ اُس کے کوائفِ زندگی کی یہ بھی اک عجیب وغریب

ناقابلِ الفکاک خصوصیت تھی کہ جب تک وہ بچھونوں کو سونگھ کر دس پانچ ٹھنڈی
سانسیں نہ بھر لیتا، اُس کو نیند نہ آتی۔ مگر میں نے مالن کو روک دیا اور خود بیٹھ کے
جلتی کھلنے والی کلیاں تھیں سب چُن لیں، اور ہار بھی وہی لئے جو ابھی پوری طرح
شگفتہ نہ ہوئے تھے، کیونکہ اک دن افضال نے "میں گل بچھاؤں کلیاں بچھاؤں
بستر پہ" کے متعلق فلسفۂ گُل پر اک طویل سلسلۂ تشبیہات و تخیلات نزاکت کے ساتھ
گویا مجھ کو متنبہ کرتے ہوئے کہ "ہار لایا کیجئے تو اُن کلیوں کے جو شگفتہ نہ ہوں بلکہ
مائل بہ شگفتگی ہوں" یہ ظاہر کیا تھا کہ گو کھلا ہوا پھول نکہت بیز زیادہ ہوتا ہے، مگر
اُس میں وہ شعریت اور موسیقیت کہاں، جو غنچۂ ناشگفتہ میں ہے۔ پھول کھل جانے
کے بعد اپنی زندگی کا جادۂ آخر ہے، مگر غنچہ جس کے انجام دیکھنے کی آرزو ہوتی ہے
اک دُنیائے اشتیاق ہے، اور لطف یہی ہے کہ اُس کی لذتیں اپنی ہی نگاہوں کے
سامنے منتشر ہوں۔ چونکہ آج اُس کو میری وجہ سے زیادہ صدمہ پہنچا تھا، اس لئے
میں نے قریب قریب مالن کی ساری ٹوکری خالی کرا لی اور ہار بھی دو ایک کے سوا
سب خرید لئے اور دامن میں رکھ کر، اُس کے عاشقانہ وجود کے لئے یہ مجروح و
دلگیر ہدیہ لے چلا۔

پورے تیس منٹ کے بعد اب میں پھر زینہ پر چڑھ رہا تھا، اور دل دھڑکتا تھا
کہ اب کیا کہیں وہی حالت نہ ہو۔ مگر نہیں وہ اب خاموش چارپائی پر لیٹا ہوا، اک
ردی کاغذ کی پتیں بنا بنا کر بگاڑ رہا تھا، اور گو نگاہیں اور ہاتھ اسی شغل میں مصروف
تھے، مگر وہ خود خدا جانے کہاں تھا جب میں اندر پہنچ گیا ہوں تب اُس کو خبر ہوئی
کہ کوئی آتا ہے، اُس نے مجھ کو یہ دیکھ کر کہ کچھ دامن میں لئے ہوئے ہے، اک حسرت کی

اور نہایت دلآویز تبسم کے ساتھ "یہ آپ کیا لے آئے؟" کہکر بے اختیار دونوں مٹھیوں میں کلیاں بھر لیں اور برآمدہ میں اک کرسی پر بیٹھکر اپنے کرتے کے دامن میں کلیاں رکھکر خاص اپنے مذاق کے موافق ان میں سے منتخب کرنے لگا۔

"آج تو کمبخت مالی نے غضب ہی کیا بالکل باغ کو اجاڑ دیا اور آپ نے بھی کمال کیا کہ اس کی دوکان کی ساری رونق چمن کے لے آئے"

وہ کلیوں سے کھیلتا جاتا تھا اور مجھ سے یہ گفتگو کر رہا تھا۔ گو میں اس کے جواب میں فوراً ہی کہہ سکتا تھا کہ "کسی طرح تمہارا غنچۂ دل تو شگفتہ ہو" لیکن اس خیال سے کہ یہ فقرہ اس کی موجودہ حالت سے زیادہ مس کرتا ہوا ہے اور ابھی ایسی گفتگو کا موقع نہیں ہے میں نے یہ کہکر ٹالدیا کہ "آج بجلی کی روشنی میں، تب بھی کچھ کھو سا گیا اور اتفاق سے وہ کلیاں زیادہ لے بھی آئی"

"لے آئی!" اک غیر محسوس تبسم کے ساتھ اس نے سوال کیا۔

"ہاں میں نے کہا کسی لے آئی کے ہاں سے تمہارے واسطے پھول لاؤں، شاید تمہاری تغیر پسند طبیعت ایک ہی جگہ کے پھولوں سے گھبرا گئی ہو"

"آہ، وہ تو کلیوں کی کثرت ہی کہے دیتی ہے کہ جنس لطیف کا نازک انتخاب اس میں شامل ہے، ورنہ وہی بھٹے پھٹے بھیانک پھول ہوتے، اچھا اس دلنوازی کا شکریہ قبول کیجیے" اس نے مسکرا کر جواب دیا "مگر آپ کے خلاف مزاج تو ضرور ہوا ہوگا کہ اتنی کلیاں میرے پاس آکے ضائع ہوئیں، معلوم نہیں کتنی نازک کلائیوں کی پہنچیاں بنتیں"

میں نے جواب دیا "خیر، وہ میرے خلاف مزاج ہو یا نہ ہو، مگر کسی کے ساتھ

تمہارا یہ احسان کیا کم ہے کہ پھولوں کے انتخاب سے جھوڑوں کے غارت گرِ حسن نہیں ہوتے"

"اور جو میں آج سے ذولتوں کے لئے حریص بن جاؤں؟"

"تو پھر مجھ کو تمہاری تعریف (Definition) بدلنا پڑے گی کیونکہ تعریف ہمیشہ جامع اور مانع ہوتی ہے، نہ کہ ہر اعتبار سے جامع۔ کلیوں کی پسندیدگی کے اعتبار سے جامعیت کا پہلو رکھو، اور پھولوں کی عدم پسندیدگی کے لحاظ سے مانعیت کا"

کامل ایک گھنٹہ ٹیبل ٹاک (Table talk) جاری رہی، مگر میں اپنی گفتگو کو اس پہلو پر لایا ہی نہیں کہ اس کے اعادۂ حالت کا شبہ پیدا ہو کیونکہ جیسے جیسے جو سرور نظر آتا تھا، اور کلیوں کو کھلتا ہوا دیکھ کر خوش خوش معلوم ہوتا تھا، مگر اس کا تبسم اب بھی پژمردہ ہی سا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ وقت کو ایسی گفتگو میں کاٹنا چاہتا ہے، جس میں اس کے موجودہ تخیلاتِ ہستی کی کہیں جھلک تک نمایاں ہو۔ میں نے اس کی اس خواہش کے پورا ہونے میں مدد دی اور اس کو یہ بات باور کرا دی کہ تمہاری خوشی میں میں بھی شریک ہوں جب وہ اس قسم کی باتوں سے تھک گیا، تو اٹھا، اور فرش پر بیٹھ کر ہارمونیم گسیٹ کے لگا ادھر ادھر ہاتھ مارنے۔ وہ جتنا اچھا گلا رکھتا تھا، ویسا ہی سبک دست ہارمونیم میں بھی تھا۔ آدھ گھنٹہ تک جتنی پُر درد صورتوں میں بہار کی چیز بجائی جا سکتی ہے، وہ بجایا گیا اور آخر میں یہ

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو  خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

نہایت رقیق لہجہ میں گا کے، با چشمِ پُرنم ہارمونیم کو سرکایا اور وہیں فرش پر لیٹ کر اک کتاب اٹھالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

وہ ہمیشہ مجھ سے دیر میں سوتا، اور دیر کو اٹھتا، مگر آج خلاف معمول وہ جلد سو گیا یا سوتا بن گیا اور صبح کو میری آنکھ کھلی تو وہ بستر پر نہ تھا!

اٹھتے ہی سب سے پہلے جس چیز پر نگاہ پڑی، وہ ایک تحریر تھی، جو نہایت نمایاں طریقہ سے میرے سامنے ہی میز پر کھلی ہوئی پڑی تھی۔

میں برق زدہ سا ہو گیا، کیونکہ میرے تمام شبہات اب ایک ایک کر کے مصدقہ صورت میں نگاہوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ اس نے لکھا تھا:۔

پیارے نیاز

میں جا رہا ہوں، لیکن کہاں؟ مجھے خود خبر نہیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ کوئی مجھے کھینچ رہا ہے، اور میرا انجذاب مضطر اس طرف اک بے اختیارانہ حالت میں مجھے لئے جا رہا ہے۔ آپ کو مجھ پر ملامت کرنے کا اختیار حاصل ہے، لیکن اگر آپ کو میری مجبوریاں معلوم ہو جائیں، تو شاید افضال اس درجہ قابل سرزنش نہ سمجھا جائے، کیونکہ مٹنے والی چیز کا ارتقا یہی ہے کہ وہ مٹ جائے۔

میری جستجو میں آپ سرگرداں نہ ہوں، اک کھوئے ہوئے کے لئے آپ اپنے حواس کیوں کھوئیں۔ میں لکھنؤ میں نہیں ہوں، مگر خیال یہی ہے کہ آپ کو اپنے افسانۂ آلام سے متاثر کرتا رہوں گا، اگر آپ لکھنؤ سے چلے گئے، تو پھر میں کس کو لکھوں گا؟

سزاوار نکوہش

افضال

(۳)

ایک تیرہ و تار مختصر سا کمرہ، جس کے سامان آرائش کی ساری کائنات ایک چارپائی

سے زیادہ نہیں، تازہ و خوشگوار ہوا سے ناآشنا، چاروں طرف کے شور و غل سے معمور شہر کی ناپاک، آلودۂ عصیاں آب و ہوا کا محل بنا ہوا، یوں تو اسی دن سے آباد ہے جب سے اس کی تعمیر ختم ہوئی، لیکن وہ ہجوم تمنا جو آج اس کے محدود و تنگ دائرہ سے طلبگار وسعت ہے، کیا اس سے پہلے بھی کبھی یہاں محسوس کیا گیا ہے؟ اتنے بڑے مقام کا دارالمسافرین! سیکڑوں ناکام و نامراد آئے اور مسرور و کامران واپس گئے۔ ہزاروں پُر امید قلب لے کر آئے اور محزون و دلگیر لوٹ گئے، مگر اُن جگر خراش حسرات، اور ان متالم تاثرات کا منظر جو آج اس مکان کا مکیں ہے، شاید اس فضا کا پہلا اضطراب ہے۔

"مانا کہ خط اُن حضرت نے روانہ نہیں کیا۔ اُن کو کیا غرض تھی کہ اس قدر زحمت گوارا کرتے، اور جہاں تک میرا خیال ہے شاید اُس پر پتہ بھی درج نہ تھا، پھر تو بالکل ناممکن ہے۔ مگر تار کا جواب بھی ندارد! اے زبیدہ مجھ کو بدگمان ہونے کا موقعہ دے۔ میں دیکھتی ہوں کہ میرا قلب ایک بڑے گناہ پر مجھے آمادہ کر رہا ہے مجھ سے انحراف فی الحقیقت اک سخت معصیت ہے۔ مگر تو ہی بتلا، پھر میں کیا کروں؟"

یہ پریشان خیالات تھے، جو اس وقت اس کمرہ کے دروازہ کے چوکھٹے میں اک قد آدم تصویر کے دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔ گرمی نہ تھی مگر اُس کی کافوری پیشانی عرق آلود تھی۔ وہ گھڑی گھڑی اپنی انگشت شہادت کے ہلال سے ان قطرات کو زمین پر گرا کے شہاب ثاقب کا منظر پیش کر رہی تھی۔ وہ پریشان بالوں کو رخسارو سے گھڑی گھڑی ہٹاتی، مگر آتش دل کا دھواں کہیں یوں مٹتا ہے، وہ پھر آ کے پسینہ میں چپک کر رہ جاتے تھے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے تھے، مگر اس موتیوں بھری صدف کا کوئی قدردان و خریدار نہ تھا۔ یہ کشیدہ قامت مجسمہ حُسن و عشق،

نازہائے نزہت و نزاکت، آہ یہ حزیں و دلگیر حمیدہ تھوڑی دیر بعد اندر چار پائی پر بیٹھی
ہوئی اپنے کرتہ کے دامن سے ہوا لے رہی تھی، اور آنکھیں ضرورت سے زیادہ
کھلی ہوئیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں، مگر اُسے چین کہاں؟ اب اُس کا اضطرا
تسکین و تسلی سے منحرف اضطرار اُس کے کھوئے ہوئے، متلاطم قدموں کے
نشانات فرشِ زمین پر شمار کر رہا تھا۔

ہر سیٹی کی آواز جو اسٹیشن سے آتی اُس کے انتظار میں ایک بے چین
اضافہ تھا۔ سامنے کی سڑک سے ہر گذرنے والی گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ اُس کو
کھینچ کر دروازہ پر لا کے کھڑا کر دیتی، مگر آہ، اب تک زبیدہ نہ آئی۔

دن کے دس بجے تھے، بازار کا سامعہ شکن شورغل پورے شباب پر تھا،
ہر شخص اپنے مشاغل میں محو اِدھر سے اُدھر چلتا پھرتا نظر آتا تھا مگر غریب حمیدہ
اب بھی تنہا تھی وہ دیکھتی تھی کہ حلوائیوں کی دوکانیں گھری ہوئی ہیں بزازوں
کی کوٹھیاں آدمیوں سے پُر ہیں وہ دیکھتی تھی کہ پان والوں کی دوکانوں پر
آزاد لوگوں کا گروہ اپنے بانکپن کو بڑے بڑے آئینوں میں دیکھ دیکھ کر خوش
ہو رہا ہے مگر حمیدہ کو کسی بات پر ہنسی نہ آتی تھی اُس کا اضطراب بحد کمال
پہنچ گیا تھا، مگر زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک گاڑی صدر دروازہ سے اندر داخل
ہوئی اور آہستہ ہو کر حمیدہ کے کمرہ کے پاس ہی ٹھہر گئی۔ ایک ملازم کوچ بکس
سے اترا اور نیچے لوگوں سے دریافت کرنے لگا کہ "کل کوئی خاتون تنہا یہاں
آ کے ٹھہری ہیں؟" حمیدہ اب اپنے دروازہ پر کھڑی تھی اور شاید وہ اک برقعہ پوش
عورت کو گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھ کر جھپٹ سے کود پڑتی، اگر وہ فوراً ہی

زبیدہ کی آغوش میں نہ ہوتی۔

دس منٹ کے بعد ہی حمیدہ و زبیدہ دونوں اُتریں اور پھر گاڑی میں چڑھ کے چلدیں۔

(۴)

۱۲ بجے شب کو، دوکانیں بند ہو گئی تھیں، بازار سنسان نظر آتا تھا، مکانات مسدود کر لئے گئے تھے۔ تمام کائنات پر ایک سکون مطلق طاری تھا جمنا اپنی نیلگوں چادر میں چاند کا ٹکڑا چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اور ناکام ہو ہو کر ساحل پر سر پٹک رہی تھی۔ متحرک امواج آب میں نشر ضیا کا وہ عالم تھا گویا حوریں اپنی زلفوں کی افشاں دھونے کے لئے پانی میں اُتر آئی ہیں۔

اس خاموش فضا کی مضطرب کرنے والی، امواج کی پُرلحن رفتار کا جواب دینے والی، جبکہ نیچر نہایت گہری نیند سو رہا تھا، صرف یہ اک آواز تھی، یہ اک پُردرد صدا تھی جس سے سارا کائنات کروٹ لیتا ہوا معلوم ہوتا تھا:۔

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
جس کے شانے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

زلفیں پریشاں ہو گئیں! آہ کس قدر تکلیف پہنچانے والا تخیل ہے۔ زلفوں کی پریشانی بھی کس قدر صبر آزما انداز ہے اور خاصکر جب وہ شانہ نواز ہوں لیکن ہے کسی کو اس منظر سے لذت اٹھانے کا موقعہ مل گیا ہو، مگر میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس وقت تک کسی کی رسائی طالع اس حد تک پہنچ جاوے کہ گیسوئے حبیب اس کے شانے پر منتشر ہوں وہ زندہ کیونکر رہ سکتا ہے، چہ جائیکہ اس حالت کے بعد؛

اس مہلت بیباک کے بعد نیند اس کی ہے امحال، غیر ممکن، بالکل قیاس سے افزوں
یہ ہو سکتا ہے کہ وارفتگی اور بیخودگی کو نیند سے تعبیر کر لیں، مگر ہائے، زلفوں کی
راتیں ایسی ہی تھیں کہ ان میں کسی کی آنکھ لگ جائے۔ دماغ اس کا ہے! اس میں
کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ اگر زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو حسِ شامہ کو برچار سکے تو
واقعی اس سے زیادہ روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی چیز اور کیا ہو سکتی ہے، مگر
افسوس یہ بھی ان لوگوں کا حصہ نہیں جن کا دماغ صرف اس وسعتِ تخیل ہی سے
گھبرانے لگتا ہے۔ یہ بھی خوب کہا کہ راتیں اس کی ہیں۔ کس قدر معنی خیز اور کیف انگیز
بات ہے، مگر آہ، یہ راتیں، یہ زلفوں کی پریشاں راتیں، کسے نصیب، یہ پریاں، یہ
سوگوار پریاں کس کی مقسوم ہیں؟" ایک طویل اور دردمند آہ پر اس صدا
کا اختتام ہو جاتا ہے اور چاند کے دریائے نور کی ایک مچھلی ساحل پر تڑپتی ہوئی
نظر آتی ہے۔

"میرے آنے سے صرف دو گھنٹے پہلے چلا جانا، یہ بھی اک ابتلائے محبت ہے
ورنہ کیا ان کے لئے دو گھنٹے اور قیام کرنا محال تھا، میں تو صرف ان کی تحریر
ان کو دینا چاہتا تھا، ان کی امانت ان کو واپس کرنا چاہتا تھا۔ اگر اس پر بھی رنج
ہوتا تو میں خود اس کو وہاں جا کر پہنچا دیتا۔ پیاری حمیدہ، مجھے اس کا رنج نہیں
کہ تو نے مجھ کو میرے سازِ ہستی کے نہایت پردرد نغمہ سے آشنا کر دیا، اس کا گلہ
نہیں کہ تیری مشتعل نگاہیں میرے لئے ناسورِ جگر بن کر رہ گئیں، آہ، یہ شکایت
نہیں کہ تیری ترچھی چتونوں نے میری ہستی میں اک مہلک رخنہ پیدا کر دیا۔ یہ تو
تیری عنایت تھی، انتہائے لطف و کرم تھا، میں ناشکر گزار نہیں، تیری جنبشِ مژگاں کا

نوید محبت، ہجان و دل قبول، تیری تشنک نظروں، تیری ہلکی جاذب نگاہوں کی پُرتکلم خاموشی کی تعمیل ہیں، مَیں اور میرا انجذاب مضطر بسر وچشم حاضر، لیکن آہ، صدمہ ہے تو یہ کہ مَیں نے تجھکو بھی اک غیر معلوم غم کا شکار پایا، تیری لبوں کی حرکت، ان پنکھڑیوں کی افسردہ جنبش میرے لئے تو فشارِ روح ہے۔ خدا کرے تو اُن تاثرات سے اجنبی ہو، جن سے مَیں آشنا ہوں، اور اُن جذبات سے بیگانہ ہو، جو میرے لئے جراحت کدۂ اضطرار ہیں۔ تو اگر مجھ کو اپنے آلام سے آگاہ کر دے تو کیا تیرے لئے مجھکو اپنے تپش تباہ و برباد کر دینا کچھ مشکل ہے، تو اس بے ضرر ہستی کو کیوں رازدار نہیں بناتی جو حُسن کی صرف اک پرستش طویل ہے، اور جو محض اس اعتقاد پر مبنی ہے کہ پھول صرف سونگھنے کے لئے ہے نہ کہ مَل ڈالنے کے لئے مَیں یہ نہیں کہتا کہ صرف مَیں ہی اس کا، اس تیری عنایت کا محل صادق ہوں، کیونکہ اگر تو چاہے، اگر یہ شمعِ حُسن پیراہن سے بے نیاز ہو کر نظارہ فروز ہو تو نو اک عالم میں پروانوں کا مذاقِ تپش پیدا کر سکتی ہے، مگر کیا تو خیال کرتی ہے کہ تیرا لرزۂ تبسّم، ہر ہستی میں وہی زخمِ شگفتگی پیدا کر سکتا ہے، جو مَیں اپنے میں پاتا ہوں خیر، زبیدہ تجھے لے گئی اُس کا حق زیادہ ہوگا، مگر کہاں؟ آہ، کوئی مقام ایسا نہیں، جہاں میں نے تجھے تلاش نہ کیا ہو، کوئی گلی نہیں جہاں تیری جستجو میں خاک نہ چھانی ہو۔ تو کیا اپنے گھر لے گئی؟ بہر حال تو جہاں کہیں بھی ہو، میری نگاہوں سے دُور ہے، میرا تجھ تک پہنچنا ناممکن ہے"

**افضال** اپنے سینہ سے اک پرچہ کاغذ نکال کے چاندنی میں دیکھنے لگتا ہے اور بے اختیار رونا شروع کر دیتا ہے، جو ہچکیوں کے سلسلہ پر ختم ہو کر اُس کو

دیوانہ وار اُٹھا کے، پھر آبادی کی راہ بتا دیتا ہے۔

## (۵)

حامد منزل کا ڈرائنگ روم، اگر موجودہ زمانہ کی آرایشات کا مکمل نمونہ نہ بھی ہوتا، تو بھی اُس کے لئے زبیدہ و حمیدہ کے منزل ہونے کا فخر و حُسن کیا کم تھا، جو وہ دیگر تصنعات کا محتاج ہوتا۔

پائیں باغ کے جانب دروازہ تازہ ہوا کے لئے کُھلا ہوا تھا اور زبیدہ و حمیدہ دروازہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ اب حمیدہ وہ کلی نہ تھی جو اختر (حمیدہ کا شوہر) کی پُر اشتیاق آغوش یا آلہ آباد کے اُس تاریک کمرہ میں افسردہ نظر آتی تھی۔ اب اُس کے قلب سے اک بڑا غم اُٹھ گیا تھا، اور اُس نے اپنی زندگی کا اک حقیقی پہلو بدلنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ایک سپید سادہ ساری اُس کے نازک جسم سے لپٹی ہوئی اُس کے سڈول اور متناسب اعضا کی پردہ دری کر رہی تھی۔ کانوں کے آویزے عارضِ گلرنگ کی چھوٹ، اور بلوری گردن کے انعکاس سے اک متبسم کیفیت کے ساتھ، گول، بھرے ہوئے شانوں کو چھو رہے تھے، لبوں کی سُرخ سیاہی مائل پپڑیاں، جو لعابِ دہن سے کبھی کبھی تر کر لی جاتی تھیں صاف کہہ رہی تھیں، کہ حمیدہ ابھی سو کر اُٹھی ہے۔ وہ نشیلی انکھڑیوں میں سرمہ کے پھیل جانے کا انداز! آہ، ان ساغروں کے چھلک جانے کا کیف انگیز لطف کچھ لانبی لانبی مژگان ہی اچھی طرح جُھک جُھک لوٹ رہی تھیں۔

آستین کی جھالریں، لوسے جسم سے مست ہو ہو کر، ہوا کا بار بار ڈھونڈھ کے

اپنا سر کلائیوں پر ٹپک رہی تھیں کہ اکبار گی زبیدہ کے دونوں ہاتھ حمیدہ کی کلائیوں پر تھے اک بے اختیار قہقہہ کے ساتھ حمیدہ نے کلائیاں چھوڑا کر کہا۔

"واہ، یہ بھی کوئی زبردستی ہے، نہیں بتلاتے"

زبیدہ "آخر یہ بات کیا ہے، کہ خط تم نے لکھا اور مجھ تک نہیں پہنچا۔ تم نے لکھا ہی نہیں"

حمیدہ "واللہ میں نے لکھا، مگر وہ تم تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا"

زبیدہ "وہی تو میں پوچھ رہی ہوں"

حمیدہ "اور وہی تو میں بتانا نہیں چاہتی"

زبیدہ "وہ تو میں تم سے صرف اس قدر انکار چاہتی تھی، تاکہ مجھے اپنے قیاس پر یقین کرنے کا موقعہ مل جائے، ورنہ کیا مجھے معلوم نہیں؟" اک مختصر سی کتاب کرسی کے گدے کے نیچے سے نکال کر "یہ کیا ہے؟ اب شرماؤگی تو نہیں؟"

نگاہ پڑتے ہی، حمیدہ کا رنگ نہایت محسوس طور سے فق ہو گیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح مذاق میں ٹال دے، مگر کامیاب نہ ہوئی اور نہایت خفیف ہو کر "تو پھر کیا ہوا؟" کہہ کے خاموش ہو گئی۔

زبیدہ علاوہ ذہین ہونے کے، چونکہ کامل دو برس تک حمیدہ کے ساتھ کالج میں رہ چکی تھی اس لئے اس کے خصوصیات مزاج سے بھی خوب واقف تھی۔ کتاب وہیں چھوڑ کر کسی بہانہ سے اٹھ کر چل دی تاکہ حمیدہ اپنے حواس جمع کرے۔

حمیدہ، جیسا کہ ذہین طبیعت کا خاصہ ہے، نہایت سریع الاحساس تھی، اور وہ مشکل سے اپنے تاثرات جذبات کو ضبط کر سکتی تھی۔ وہ اب اپنے اوپر ملامت

کر رہی تھی کہ جب اُس کو اپنے قلب و دماغ پر اس قدر قابو نہ تھا، تو اُس نے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا۔ اگر زبیدہ نے میرے روزنامہ میں اُس واقعہ کو پڑھ ہی لیا تو بھی میں نہیں سمجھتی کہ آخر مجھے حجاب کیوں ہے۔ میرے خیال میں تو اس میں کوئی بات ایسی نہیں، جس سے زبیدہ ایسا خیال قائم کر سکے؛ مگر یہ سب غلطی میری ہی ہے کہ اپنے اصرارِ انکار، اور جب کتاب سامنے آگئی تو اپنے حجاب سے بالکل یقین دلا دیا؛ لیکن خیر، اب میں اُس کے تردید کی کوشش کروں گی اور پوچھوں گی کہ آخر وہ سمجھی کیا اور کیونکر؟

تھوڑی دیر میں زبیدہ ہاتھ میں اک اخبار لئے ہوئے، مسکراتی ہوئی آئی، مگر وہ ابھی اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ حمیدہ بولی "یہ تو بتاؤ کہ آخر تم نے میرے اُس واقعہ کے نہ بتانے سے کیا قیاس قائم کیا اور کیونکر؟ وہ کون سی بات ہے جو اُس اندراج میں میرے لئے وجہ نکوہش ہے"

"وجہ نکوہش تو خیر نہیں، مگر ہاں وجہ ندامت ضرور ہے" زبیدہ بولی۔

حمیدہ نے کہا "وہ کیونکر؟"

زبیدہ "مشاہدہ میں گو بُرہان و حجت درکار نہیں، لیکن میں تم سے اپنے خیال کے وجوہ بھی بتا سکتی ہوں، مگر خیال یہی ہے کہ کہیں تم پھر نہ شرما جاؤ"

حمیدہ "اچھا آپ بتلائیں تو سہی، ایک دفعہ اتفاق سے آپ نے میری کمزوری طبیعت سے کیا فائدہ اُٹھا دیا کہ اب ہمیشہ آپ کو (تم سمجھے) مغالطہ قیاسات سے مجھے مجبور کرنے کا یقین واثق ہو گیا"

زبیدہ۔ "آخر تم نے بھی کچھ سمجھا ہے کہ میرا خیال کیا ہے؟"

حمیدہ: "مجھے کیا معلوم"

زبیدہ: "جب تمہیں معلوم نہیں تو پھر تمہیں اک غیر معلوم شئے کو غلط کہنے کا کیا حق حاصل ہے؟"

حمیدہ، زبیدہ کی اس منطق سے پھر کچھ گھبرا سی گئی، مگر جی کڑا کر کے بولی "اچھا خیر، مجھے نہیں معلوم، تو تم ہی بتا دو، میں کسی تعین کے ساتھ غلط نہیں کہتی بلکہ اس کے متعلق تمہارا جو خیال بھی ہے غلط ہے"

زبیدہ: "تم نے اُس میں جتنا لکھا ہے، بادی النظر میں اُس سے زیادہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہ تھی، مگر تمہارے مسلسل انکار نے مجھ کو مجبور کیا کہ اُس کے ہر لفظ پر غور کروں، اور اس لئے اب میں ویسا ہی سمجھتی ہوں جیسا حمیدہ نے اس اجنبی کو اچھی طرح دلنشین کر لیا ہے۔ میں ایسی ضعیف الذہن نہیں ہوں کہ تمہاری عادات و خصوصیات کو بھول گئی ہوں۔ تمہارے روزنامہ میں جس نمایاں اور بڑا احتیاط طریقے سے اُس واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے، اُس صراحت کے ساتھ اور کوئی واقعہ درج نہیں ہے۔ تمہیں کہو کہ موسیقی کے نوٹ سے زیادہ تم نے اور کسی یادداشت کو زیادہ خوشخطی کے ساتھ کبھی کالج میں لکھا ہو۔ جس چیز میں تم کو انہماک ہوا اسی قدر تم نے کی اور سارا حسن ترتیب اسی پر صرف کر دیا۔ کیا ریاضی وغیرہ کی کاپیاں میں نے تمہاری نہیں دیکھیں؟ سارے روزنامہ میں، تمہیں اک اسی واقعہ کو اس قدر احتیاط کے ساتھ تفصیل سے لکھنا تھا، اور وہ بھی سفر ایسے پر خلجان سفر کی حالت میں؟ اس کو بھی جانے دو، تم کو اس قدر غیر معمولی طور سے طول دینے کی ضرورت کیا تھی، اور تمہیں کیا حق حاصل تھا کہ کسی کے حسن صورت کے بیان اور اس کے

شاعرانہ عادات وخصائل کے اظہار میں اس قدر جسارت سے کام لو؟ واقعی انسان دل کو تسلی دینے اور اپنے مطلب کے موافق تاویلیں کرنے میں بہت عجلت اور جرأت سے کام لیتا ہے۔ مجھکو رنج ہوگا، اگر تم نے مجھ سے کوئی بات چھپائی، نہ اس لحاظ سے کہ تم مجھ کو بے اعتبار سمجھتی ہو، بلکہ اس خیال سے کہ جس کے جانب تم اپنے کو یوں غیر ملتفت ظاہر کر رہی ہو، وہ اس وقت تمہارے لئے خدا معلوم کہاں کہاں کی خاک چھان رہا ہے" یہ کہا اور اخبار سامنے ڈال دیا، جس میں تحریر تھا:۔

" **افضال** فورتھ ایر کلاس کیننگ کالج لکھنؤ کا متعلم، اپنے کسی مقصود کے تلاش میں بتاریخ ۲۵ مارچ، کہیں چلا گیا ہے۔ آدمی خوش رُو اور بالکل نوجوان ہے۔ وضع وخصائل کے لحاظ سے نہایت وارفتہ مزاج واقع ہوا ہے۔ عینک اس کی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ چلنے میں ذرا آگے کو جھکا رہتا ہے، جن صاحب کو مل جائیں، بغیر اُن کی اطلاع کے ایک تار اس پتہ سے روانہ فرماویں"

نیاز، امین آباد پارک نمبر ۴۵ لکھنؤ

"اپنی یادداشت کو اس سے ملاؤ اور پھر تاریخ کو منطبق کرو۔ کیا کوئی دوسرا شخص ہوسکتا ہے؟"

زبیدہ، یہ کہہ کر چلی گئی۔

واقعی امر یہ ہے کہ اس وقت تک حمیدہ نے اپنے قلب کا صحیح اندازہ نہیں کیا تھا، جس وقت اُس کا خط لکھنؤ اسٹیشن پر گرا اور افضال نے اس کو اٹھا لیا وہ ایسے وقت کی بات تھی جب گاڑی حرکت کر چکی تھی، مگر اس واقعہ سے قبل آدھ گھنٹہ تک وہ **افضال** کو پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے دیکھ چکی تھی اور اُس کے

ہر انداز کو حمیدہ پوری طرح سمجھ کر اپنے روزنامہ میں درج کر چکی تھی، لیکن اُس کا یہ خیال اُس کی نگاہ میں صرف پسندیدگی کی حد تک نظر آتا تھا، لیکن اب اخبار کے اس اعلان کو دیکھ کر، وہ اکبارگی چونک پڑی، اور وہ چنگاری جو اس وقت تک اُس کے قلب میں دبی ہوئی تھی مائل اشتعال نظر آنے لگی۔ اب اُس کی سمجھ میں آیا کہ اُس کا خیال کیوں **افضال** کی طرف اتنی جرأت کے ساتھ مبذول ہوا تھا، اور اس انجذاب کی علت کیا تھی۔

اُس کا قلب فطرتاً رقیق تھا، مگر جب وہ کسی چیز سے متاثر و متالم ہوتا، تو وہ ایک سیّال شے تھا جو فوراً آنکھوں سے نکل پڑتا۔ **افضال** کے یوں چلے جانے کو اُس نے بہت زیادہ محسوس کیا اور آنسو پی پی کر رہ گئی۔

"اُس کے حسن میں کلام نہیں، مگر اس یقین کے لئے کیا وجہ ہے کہ وہ حسن میری طرف مائل بھی ہو۔ اُس کی پُرکیف آنکھیں، اُس کا مست طرزِ خرام، اُس کی وارفتگی نظارہ ان سے میں یہ سمجھی تھی کہ یہ کوئی مٹا ہوا آدمی ہے، اور اسی لئے میں نے اُس کی ہر ہر ادا کو نہایت غور سے دیکھا تھا، مگر آہ، یہ نہ سمجھ سکی تھی کہ وہ مٹنے اور مٹانے کے لئے مصروفِ خرام تھا۔ جب اُس نے خط اُٹھایا ہے تو وہ مجھ سے بہت زیادہ قریب تھا اور میں نے اس بات کو دیکھا تھا کہ وہ مجھے نہایت مسترحم اور متمنی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے لیکن میں سمجھی تھی کہ یہ اُس کی نگاہوں کی عادت مستمرہ ہو گی۔ شیروانی کے نیچے اُس کے کُرتے کا کھلا ہوا گریبان، ٹوپی کے نیچے پیشانی پر موئے مرغولہ کا انداز، اور وہ آخری طویل نمناک نگاہِ ابتلا، یہ وہ باتیں تھیں جن سے محبت کہہ لینے کے لئے صرف اک ارادہ درکار تھا۔ اور وہ ارادہ۔

ہیں سے دھو کا کھایا۔ شاید میں کر چکی تھی۔ کیننگ کالج کا بی۔اے کا متعلم،
ایسا وارفتہ وضع اور ایسا شاعرانہ مزاج رکھنے والا، لکھنؤ سا مقام اور ایسا حسین
نوجوان، کیسے یقین کروں کہ اس کا ترکش ویسا ہی تیروں سے بھرا ہوگا، کیسے
باور کروں کہ اُس کی نگاہیں معصوم ہوں گی۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو، اس میں شک نہیں
کہ وہ آنکھیں خوش نصیب ہیں جو اس حسین صحیفۂ قدرت کا مطالعہ کریں اور قابل رشک
ہے وہ قلب جو اس شعر زی حیات کا دردمند ترنم ہو۔ اللہ کرے۔ وہ مسرور
وخرم ہو اور جلد اپنے مقصود کو پالے"

یہ تخیلات تھے جو اس وقت حمیدہ کے دماغ میں معمور تھے، اور وہ اُن سے
اک خاموش لذت اٹھا رہی تھی۔

(۶)

جہاں افضال نے ایسا لطیف دماغ اور ایسا شاعرانہ مذاق پایا تھا، وہاں
ایک بات یہ بھی عجیب وغریب پائی تھی کہ وہ ایسے لوگوں سے بھی ملتا جو اُس کی
طبیعت کے بالکل منافی تھے۔ اور پھر طرفہ تماشہ یہ تھا کہ جب میں ایسے لوگوں کے
ساتھ اُس کو دیکھ کر متعجب ہوتا، تو وہ میری حیرانی کو محسوس کر کے مسکرا دیا کرتا۔

**عثمان**، ضرورت سے زیادہ خاموش، نہایت کھلا ہوا بد مذاق چہرہ
رکھنے والا، انگریزی وضع کا دیوانہ اک ایسا بے کیف آدمی تھا کہ جب وہ امین آباد
پارک میں شام کو آتا۔ اور وہ روز افضال سے ملنے آتا تو وہ صرف
اس امر کی واقفیت بہم پہنچاتا کہ فلاں دوکان کا کیا کرایہ ہے اور یہ نسبت
چوک کے یہاں گھی کس قدر گراں فروخت ہوتا ہے۔ وہ فطرتاً اک خود غرض

تاجر تھا اور مناظرِ قدرت کے جانب سے اُس کے دل و دماغ پر ایسی مہر لگی ہوئی تھی کہ وہ اک سبز و شاداب باغ سے اس قدر جلد نکل بھاگنے کی کوشش کرتا، گویا موجِ نکہت اُس کے لئے اک تازیانہ ہے، جو ٹھہرنے نہیں دیتا۔ وہ جب کوٹھے پر برآمدہ میں بیٹھتا تو ہمیشہ کرسی کی پشت (Lawn) قطعۂ مرغزار، اور فوارہ کی طرف کرکے بیٹھتا۔ اک شام کو وہ بیٹھا ہوا عینکوں اور ڈیری فارم (Dairy Farm) کے اصول تجارت پر رائے زنی کر رہا تھا اور اپنی آیندہ زندگی کے نسبت کہہ رہا تھا کہ میں تو (Auctioneer) نیلام کنندہ بننا چاہتا ہوں۔ **افضال** اُس کی باتیں سنتا جاتا تھا اور میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ کے مسکراتا جاتا تھا، مگر میں اس درجہ پریشان تھا کہ بار بار اُٹھ بھاگنے کا ارادہ کرتا تھا۔ میں اس فکر میں تھا کہ اس کے بد مذاقی کا کوئی عوض لوں، چنانچہ دورانِ گفتگو میں زبردستی میں نے لٹریچر کا ذکر چھیڑ دیا اور اک طویل بحث کے بعد میں نے بلا کسی وقفہ کے میر و مومن کے اشعار پڑھنا شروع کئے۔ گو وہ اس تذکرہ سے سخت کبیدہ ہو رہا تھا، لیکن میں نہایت مسرور تھا کہ جیسا یہ میرا جی دکھایا کرتا ہے آج میں بھی اس کا دل دکھا رہا ہوں۔ جب میں نے دیکھا کہ اُس کی نفرت اب ناقابلِ ضبط ہے تو اک آخری حملہ کی صورت میں، میں نے کہا "ذرا سنئے گا عثمان صاحب" میر لکھتا ہے:۔

کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میر نظر آئی — شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
اُس کی تو دل آزاری بے ہیچ ہی تھی یارو — کچھ تم کو ہماری بھی تقصیر نظر آئی

یہ سنکر **افضال** تو خدا معلوم کس عالم میں پہنچ گیا، مگر **عثمان** کچھ ایسے بدحواس طریقہ سے کوئی بہانہ کرکے بھاگ گیا کہ میں ہنستے ہنستے بیتاب ہو گیا۔ میں **افضال**

سے پوچھتا کہ آخر اس سنگِ منجمد سے تم ایسا نازک طبیعت والا آدمی کیونکر نباہ سکتا ہے؟ تو وہ جواب دیتا کہ "میں اُس کے خلوص کی قدر کرتا ہوں" وہ عثمان کے گھر بھی اکثر جاتا اور کہتا کہ "اُس کے والدین بہت عنایت کرتے ہیں" مگر غالباً سبب کوئی اور تھا جس کو وہ اس عنایت سے تعبیر کرتا اور مجھ سے مصلحتاً چھپاتا۔

علاوہ عثمان کے اک شخص اور نصیر تھا جو اس لحاظ سے کہ جاہلِ محض تھا اُس سے بھی زیادہ قابلِ نفرت و استکراہ تھا، وہ سرِ راہ اپنے کسی دوسرے دوست کے گلے میں ہاتھ ڈال کے چلنے کا سخت عادی تھا، مگر شاید اس کا خلوص بھی افضال کو اُس سے ملنے پر مجبور کرتا تھا۔ اس لفظ خلوص کا جیسا بُرا استعمال میں نے اس کے وجود میں پایا، اُس کی نظیر مجھے کہیں نہیں ملی۔

میں ان لوگوں سے کسی قسم کی امید نہ رکھتا تھا، کیونکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ جو شخص مذاقِ شاعری سے بیگانہ ہوتا ہے، اُس کا دل و دماغ اخلاقِ حسن کا محل ہو ہی نہیں سکتا، پھر بھلا میں ان پارہائے سنگ خارا کو کیونکر مستثنےٰ دیکھتا افضال کے چلے جانے کے بعد میں کہیں نہیں گیا، اس خیال سے نہیں کہ اُس نے منع کر دیا تھا، بلکہ میں اُس کی تلاش کو اک فعلِ عبث سمجھتا تھا۔ نہ کسی قیاس پر تیقن ہوتا تھا، اور نہ اُس کے حالاتِ گذشتہ سے اس پر کچھ روشنی پڑتی تھی۔ میرے اعلان کو ایک ہفتہ سے زاید گذر گیا تھا اور اسی اُلجھن میں اک شام کو اپنی تدابیر کے نسبت کوئی قطعی فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ پوسٹ مین نے ایک لفافہ دیا۔ اُس میں تحریر تھا:۔

"آپ کے افضال کے نسبت مجھے اس امر کے باور کرنے کی وجہ ہے کہ وہ ۵ مارچ

کو الٰہ آباد میں تھے۔ افسوس ہے کہ مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی، ورنہ شاید یہ کہا جا سکتا
کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔ بہر حال آپ گڈھی کی سرائے الٰہ آباد میں اُن کی جستجو کر سکتے ہیں
اور اگر وہ آ گئے ہوں، تو اُن سے کہہ دیجئے کہ جو امانت اُن کے پاس ودیعت ہے
اُس کو محفوظ رکھیں۔ صاحبِ امانت خود لکھنؤ حاضر ہو کے اُسکے واپسی کی درخواست
کرے گا"

ح۔م

کم از کم دس بار میں نے اس تحریر کو پڑھا، اور ہر دفعہ حیرت و استعجاب میں اضافہ ہوتا گیا۔ نہ کاتب کا نام نہ اُس کا پتہ اور نہ سوادِ خط سے آنکھیں آشنا۔ اندازِ تحریر اس نوع کا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قصداً اس امر کے چھپانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مخاطبہ کسی مرد کے جانب سے ہے یا عورت کی طرف سے اور اسی لئے ذہن اس امر کو قبول کرتا ہے کہ جنسِ لطیف کا کوئی فرد اس کا مصنف ہے۔ مگر یہ امانت کیا؟ اور صاحبِ امانت کیا معنی؟ اور پھر اُس کا خود لکھنؤ آ کے طلب کرنا! خوفناک ناقابل الفہم معمّا تھا جس کے سمجھنے کی کوشش بالکل بیکار تھی۔

(۷)

"آہ۔ زہرہ! میں لاکھ سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں، مگر اسے کیا کروں کہ سمجھنے کو جی نہیں چاہتا" یہ الفاظ تھے جو مظفر منزل کے بالاخانے میں اک کمسن نازنین کے منہ سے نکل رہے تھے۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی، گردن جھکائے رومال کے کناروں کو موڑ رہی تھی اور قلب کی خلشِ نہاں چہرہ پر افسردگی بنی ہوئی چھائی ہوئی تھی۔

"میں یہ کہتی ہوں کہ جو شخص صرف دو چار روز کا مہمان ہو، جس کے حالات

ایسے مبہم ہوں، اور جو دیوانوں کی طرح ہر وقت اپنے خیال میں محو ہو، اُس سے الفت آخر کس امید پر؟" زہرہ نے کہا۔ رقیہ نے جواب دیا "ہائے مجھے اُس کی دیوانگی ہی نے تو دیوانہ بنا دیا ہے، تین دن ہوئے کہ میں اپنے جذبات کو ضبط کر رہی ہوں اور اپنے اوپر لفرین کرتی ہوں، مگر میں جس قدر اُس صورت کو مٹاتی ہوں، اُس سے زیادہ وہ مجھے مٹا رہی ہے۔ اب تو اُس کو بھلا دینے کا خیال میرے لئے اک ملامت ہے۔ نتیجہ جو کچھ بھی ہو، میں اُس کے مقابلہ کیلئے تیار ہوں تم کو اور جس طرح ممکن ہو، یہ اُن کی نگاہوں تک پہنچا دو، آگے میری قسمت"

**افضال**، آج چار دن ہوئے کہ مولوی مظفر بیرسٹر کے مکان پر مقیم ہے مولوی صاحب اعلان کو دیکھ چکے تھے اور اتفاق سے اس کو وہائٹ اسٹریٹ بمبئی میں پاکر اپنی کوٹھی پر لے آئے تھے۔ ان کو **افضال** سے اس درجہ اُنس ہو گیا تھا کہ اُس کی جدائی اُن کو کسی طرح گوارا نہ ہوتی تھی۔ اور گو وہ اس پابندی سے نہایت پریشان تھا مگر مولوی مظفر صاحب کی مہمان نوازیوں نے اُسے ایسا مقید کر رکھا تھا کہ بلا اُن کی اجازت کے چلا جانا وہ اک اخلاقی گناہ سمجھتا تھا۔ اس وقت تک **افضال** کو اعلان کی خبر نہ تھی اور نہ اس نے بیرسٹر صاحب سے اپنے حالات کا انکشاف کیا تھا۔

دوپہر کو افضال لیٹا ہوا، اپنے خیالات میں مستغرق تھا کہ زہرہ (خادمہ) آئی اور خاصدان رکھ کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے خاصدان سرکایا اور سرپوش اٹھایا تو اُس کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ پانوں کے نیچے اک پرچہ کاغذ رکھا ہوا ہے جس میں یہ تحریر ہے:-

"اک دُکھے ہوئے جی کی بیقرار دل کی مضطرب دعائیں، اگر فرصت ہو، تو قبول کر لیجئے،

اور اپنی سرکارِ حُسن میں اک پرستارِ محبت کا یہ پیام پہنچا دیجئے کہ

"اب تو نگاہ ناز کو اپنی تو دلنواز کر"

اوّل تو **افضال** نے اس تحریر کے دیکھنے کی جرأت نہیں کی، مگر اک بار پڑھ لینے کے بعد وہ اس درجہ متاثر ہوا کہ بے اختیار اک طرف کو کروٹ لے کے رونے لگا۔ آدھ گھنٹہ تک اُس پر یہ حالت طاری رہی اور جب جی کچھ ہلکا ہوا، تو اس نے پھر دیکھنا شروع کیا اور اپنے تخیلات کو وسعت دینے لگا۔ گو **افضال** کے دل و دماغ میں سوائے حمیدہ کے اور کسی کی گنجائش نہ تھی، مگر اس تحریر سے اُس کے قلب کا متحرک نہ ہونا یہ بھی اس کے فطرت کے خلاف تھا، وہ دیر تک اس کے مزے لیتا رہا اور اب وہ ایسا محسوس کرنے لگا گویا **مظفر منزل** اُس کا گھر ہے۔ **افضال** فطرتاً اس امر کا بہت شائق تھا کہ اُس کی ناز برداری کی جائے، اور جب کوئی ایسا شخص اُس کو مل جاتا، تو پھر اُس سے زیادہ نازک مزاج بھی کوئی نہ تھا۔ وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس تحریر کا مخاطب وہی ہے؛ لیکن اُس کا کاتب کون ہے؟ اس کے سمجھنے کی وہ کوشش کر ہی رہا تھا کہ زہرہ پھر آئی اور گھبرا کے اُس نے پوچھا:-

"حضور کو کوئی کاغذ تو خاصدان میں نہیں ملا، اور آپ نے پڑھا تو نہیں؟"

**افضال** اس سوال سے ذرا کبیدہ خاطر ہوا اور جواب دیا کہ ہاں کاغذ تو ضرور تھا، اور میں نے اُس کو پڑھ بھی لیا ہے، لیکن اگر اس میں میری کوئی غلطی تھی، تو میں معافی چاہتا ہوں، لیجئے یہ کاغذ اپنا"۔ زہرہ بولی "نہیں اب میں اسے کیا کروں گی، چھوٹی بیگم صاحب نے اُس کو لکھا تھا،

اور میں غلطی سے یہاں لے آئی، جب اُن کو یہ معلوم ہوا، تو وہ مجھ پر بہت ناراض ہوئیں اور حکم دیا کہ جا، جس کو دے آئی ہے اُسی سے جواب بھی لے آ، اس لئے اُس کا جواب دید یجیئے۔" افضال، اُس کے اندازِ گفتگو، اور چھوٹی بیگم صاحب کی شوخی و ذہانت پر بے اختیار مسکرا پڑا اور اُس کے پشت لکھدیا۔

"نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں"

رقیہ نہایت بیتابی کے ساتھ اپنے کمرہ میں ٹہل رہی تھی، اور زہرہ کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی، کہ وہ نظر پڑی۔ اُسے اس قدر تاب کہاں تھی کہ اپنی جگہ پر قایم رہتی، پہلے زہرہ کی شکل کو دیکھا، اُس کے انداز پر غور کیا کہ کوئی خلاف توقع، امید شکن خبر لیکر تو نہیں آرہی، اور پھر فوراً آگے بڑھکر اُس کے ہات سے کاغذ چھین لیا، چہرہ غیر معمولی مسرت سے چمکنے لگا، اور لگی ہر ہر لفظ کو غور سے دیکھنے۔ انشا کا یہ شعر اس سے زیادہ منہمک شوق کے ساتھ شاید کبھی نہ پڑھا گیا ہوگا۔ وہ سوادِ خط کو دیکھتی اور خدا معلوم اُس سے کیا کیا سمجھنے کی کوشش کرتی بیسیوں تاویلیں اُس کے ذہن میں گذریں، سیکڑوں مفہوم اُس کے دماغ نے پیدا کئے، لاکھوں اُمیدیں اُسپر قایم کرکے رد کردی گئیں مگر اُسکی بیصبر آنکھیں تو اُس تحریر کو کاغذ سے چھین لینے کی کوشش کر رہی تھیں، اُس کا قلب اِس شعر کو اپنے عمق میں جگہ دینا چاہتا تھا۔

چونکہ وہ فطرتاً، وارفتگی پسند اور شاعرانہ مزاج رکھتی تھی، اس لیئے افضال کی
اس تحریر سے، جو فی الحقیقت ایک افسانۂ درد محبت تھی، وہ اس درجہ متاثر ہوئی
کہ بے اختیار اُس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

رقیہ، ایک دولتمند خاندان کی ناز پروردہ لڑکی، اثرات تعلیم کے وجہ سے نہایت
فہیم، بیباکانہ خصائل سے متصف، حسن صورت کے ساتھ جذبات لطیف سے مالا مال
عنفوانِ شباب کے ناقابل ضبط جوش سے متہیج سینہ رکھنے والی، شاعرانہ کیف کی
مبہوت وارفتگیوں سے مزہ لینے والی، یونہی اپنے مست و مخمور قدموں سے آمادۂ
لغزش تھی کہ دفعتاً افضال کا حسنِ عالم آشوب رقیہ کی تباہی کا بہانہ ہو گیا،
اُسکے دردمند سینہ کے شق ہو جانے کیلئے صرف ایک حیلہ درکار تھا اور آخر کار وہ حیلہ اُسے گھر بیٹھے ہاتھ آ گیا
رقیہ خوب سمجھتی تھی کہ وہ لوکین جو لال کی طرح اپنی سبک پروازی کے ساتھ نگاہوں کے
سامنے اڑا جا رہا تھا، ایک نعمت تھا، اور بعض اوقات وہ اپنی مبہم خلشِ جستجو سے تنگ آ کر نہایت
حسرت سے اُسکے عود کر آنیکی خواہش ظاہر کرتی، مگر اُسے یہ خبر نہ تھی کہ حصول مقصود کے بغیر
شباب کی لذات منقبض کیسا پُر لطف انبساط، کیسا پُر مزہ انتشار چاہتی ہیں، رقیہ کو چاہنے
اور چاہے جانے کی لذتوں سے صرف کیا سی آگاہی تھی، اور اسلیئے اُس غریب کو کیا خبر تھی کہ
محبت صرف اک پسندیدگی نہیں ہے بلکہ وہ اک پرستش ہے بیتاب، اک لذت ہے مضطرب
اک لطف ہے بیقرار، جسوقت تک اُسنے افضال کو نہ دیکھا تھا وہ اک حسین شے کو دیکھ کر صرف
اس حد تک متاثر ہوتی کہ وہ اُسے اک دلآویز چیز سمجھتی، مگر جب افضال پر نگاہیں پڑیں تو اُسکی
سمجھ میں آیا کہ وہ صرف دلآویز ہی نہیں، بلکہ دل آزار بھی ہے، اُس کو حیرت تھی کہ اگر
کوئی باغ کی روشوں پر مصروف خرام تھا تو اُس کا جی نہ کیوں

چاہتا تھا کہ کلیجہ قدموں کے نیچے رکھ دیجیے، افضال کی نگاہیں اگر کسی پھول پر پڑتی تھیں، تو اُس کو کیوں یہ تمنا ہوتی تھی کہ اس سے اُٹھیں تو اِدھر ہی پڑیں۔ وہ کیا چیز تھی جو اس کے ہر خط و خال سے رقیہ کو اذیت یاب بنا دیتی تھی۔ اس کو اُس نے کامل تین دن تک سمجھا اور پورے غور کے بعد آخر اُس نے یہ فیصلہ کر لیا اگر ہستی عبارت ہے زیست سے اور زیست سے مراد ہے سکون و راحت، آرام و مسرت، تو مجھے افضال کا پہلو تلاش کرنا چاہیئے۔ رقیہ فطرتاً بہت مستحکم ارادہ رکھتی تھی اور سمجھتی تھی کہ ایک شخص کے زندگی کے بابت خود اُس سے اچھا فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا، اور اسی بنا پر اُس نے یوں بے حجابا افضال کو تحریر بھیج دی تھی۔ وہ صرف یہ سن چکی تھی کہ افضال کیننگ کالج کا متعلم ہے اور مظفر صاحب کا بہت عزیز مہمان ہے اور اس سے زیادہ کچھ حال معلوم نہ تھا، لیکن دیکھ لینے کے بعد اُس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اُسے اپنے قلب کا محبوب مہمان نہ بناتی، اور اُس تحریر کا جواب آنے کے بعد یہ بالکل محال تھا کہ وہ صرف اسی پر صبر کرتی۔ اُس کی تمنائیں کھل پڑیں اُس کی آرزوئیں بکھر گئیں اور اُس نے نہایت بیباکانہ ان الفاظ میں اُس کا جواب دیا:—

"توقع جن سے تھی کچھ خستگی کے داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے"

"اے نکہت بادِ بہاری کی گستاخی سے چیں بجبیں ہو جانے والے، اور اُس کی پریشانیوں کو اٹکھیلیاں سمجھ کے مُنہ پھیر لینے والے، میاں مسافر، ذرا میں بھی تو سنوں، ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ یہ دل دکھانے والے کیسے بیزار ہوتے ہیں۔ کیا جب وہ بیزار ہو بیٹھتے ہیں، تو یوں ہی تکلیفیں پہنچایا کرتے ہیں، یوں ہی قیامتیں ڈھایا کرتے ہیں؟ آپ اس کا جواب دیں یا نہ دیں، لیکن اس وقت میری نگاہوں میں آپ کی

جنبشِ لب پھر رہی ہے اور اک نامعلوم صدا میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہے کہ جی ہاں یوں ہی بیٹھتے ہیں اور یوں ہی آفتیں ڈھاتے ہیں" خیر صاحب یہ ستم بھی گوارا، یہ زبردستی بھی تسلیم۔ میری غلطی تھی کہ اس آفت بے محابا کو دیکھ کر کیوں زخم نظارگی حاصل کیا، میری خطا تھی کہ ایسے بے پناہ فتنہ خراماں سے کیوں تمنائے پامالی کی گئی، لیکن میں اس کو بھی آپ کی مرحمت آپ کا امتنان خیال کروں گی اگر آپ نے میرے لئے اس سے زیادہ سامانِ تپش اس سے زیادہ اسباب اضطرار مہیا کرنے کی تکلیف نہ گوارا فرمائی۔ اب جو آپ نے دل دکھایا ہے تو دل پُرسی بھی کیجئے، مجروح کیا ہے تو جراحت نوازی کو بھی کام میں لائیے، لیکن آہ، جس وقت یہ سوچتی ہوں کہ آپ تو کیننگ کالج کے متعلم ہیں، آپ ہمیشہ یہاں رہنے کے لئے نہیں آئے، تو اس زہر پیکاں کے تعاقب سے میں اپنے تخیل میں بھی گھبرانے لگتی ہوں۔ کیا واقعی آپ مجھے ہلاک کر کے چلے جاویں گے؟ نہیں، خدا کے لئے ان حیات سوز نگاہوں ان برق پاش نظروں سے مجھے ہمیشہ تڑپانے کی کوشش کیجئے۔ آپ کی جلوہ طرازی نے جس قدر تمناؤں سے میرے دلِ ناتواں کو معمور کر رکھا ہے، اُس کے اظہار کے لئے اک عمر طویل کی ضرورت ہے، لیکن اگر یہ ممکن نہیں، تو کم از کم اپنے عزیز وقت کی چند ساعتیں ہی عنایت کیجئے اور اک دردمند محبت کے بیانِ درد سے مسرور ہو لیجئے"

بدنصیب

رقیہ

افضال، رقیہ کی پہلی تحریر کا جواب تو دے چکا تھا، مگر اُس کا ضمیر اُسے ملامت کر رہا تھا، اُس کی غیرت اُس کو نفرین کر رہی تھی، کبھی وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ

چیں بہ جبیں مُنہ پھیرے ہوئے اُس کے سامنے کھڑی ہے اور کبھی وہ مظفر صاحب کو منفعل اور کبیدہ خاطر اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھتا۔ وہ اسی خیال میں مستغرق بکلفت تھا کہ زہرہ پھر آئی اور اب کے علانیہ اُس نے دوسری تحریر سامنے لاکر ڈال دی اُس نے چاہا کہ زہرہ کو بُلا کے یہ تحریر بلا دیکھے واپس دیدے اور گو شرافت اسی امر کی مقتضی تھی، مگر حق یہ ہے کہ اُس کا شباب اخلاق شکن تھا اور وہ اپنی داعیاتِ شباب اور لذت جو طبیعت سے مجبور ہو رہا تھا، تھوڑی دیر وہ اسی کشاکشِ شباب و فطرت میں اُلجھا رہا اور پھر آخر کار اُس نے اُٹھا کر اُس تحریر کا مطالعہ شروع کردیا۔ وہ رقیہ کی اس آزاد تحریر اور اُس کے بیباک اندازِ مخاطبہ سے کانپنے لگا، مگر ہائے اس کو وہ کیا کرتا کہ افضال کے لیئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُس کو اپنے نازشِ حُسن سے اس درجہ مسرور ہونے کا سبب ہاتھ آگیا۔ وہ اپنے تئیں حسین سمجھتا تھا اور دلربا سمجھتا تھا، مگر اپنے اثراتِ حُسن کی کہانی آج پہلی دفعہ اُس نے جنس لطیف کی زبانی سُنی، اس لیئے وہ خفیف سے اظہار تبختر کے ساتھ ٹہلنے لگا، اور اپنے چہرہ کی سُرخی کو دیوار کے آئینوں میں دیکھ دیکھ کر کچھ عجب کیفیت انگیز مسرت کے ساتھ وہ سوچنے لگا کہ اس صورت میں اُس کو کیا کرنا چاہیئے " رقیہ کی تحریر اس میں کلام نہیں کہ تصنعات سے معرا ہرگز نہیں سمجھی جاسکتی، گو کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہو اور اس لیئے وہ قابلِ ملامت نہیں ہوسکتی، مگر میرے لیئے یہ شایاں نہیں کہ اُس کے امیدوں کو اور جسارت کرنے کا موقعہ دوں، ممکن ہے کہ پھر وہ اس خیال سے باز آئے اور میں کبھی آسانی و مسرت کے ساتھ اس مقام کو خیرباد کہہ سکوں، لیکن اگر ایسا نہ ہوا، تو؟" وہ کچھ سوچتا تھا، کچھ ڈرتا تھا، کچھ ہمت کرتا تھا اور رہ رہ جاتا تھا

اور کسی نتیجہ آخر پر نہ آسکتا تھا۔ اُس نے کامل ایک گھنٹہ اس پر غور کیا اور گھڑی میں دیکھا کہ مظفر صاحب کی واپسی کو صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا، اُس نے دوسرے پرچہ پر آخر یہ جواب رقیہ کو لکھ ہی دیا:۔

"عنایت نامہ، جس میں خوب جی کھول کر آپ نے مجھے بنایا ہے، فردوس گوش ہوا، چاہے اُس میں واقفیت ہو یا نہ ہو، مجھ ایسے سریع التاثر نفس کے لئے اُس میں ضرورت سے زیادہ دل دُکھانے کا سامان مہیا تھا، اور باور کیجئے کہ میں اُس سے نہایت متالم ہوں، آپ کو اگر میری وجہ سے یہ تکلیف اُٹھانا پڑی تو میں نہایت انفعال و ندامت کے ساتھ اعتراف خطا کرتا ہوں اور اُمید ہے کہ آپ درگذر فرمانے میں پوری سعی کریں گی۔ آپ کی کہانی سُننے کے لئے عمر طویل کیا اگر نہ ملتے تو اُن سے عمر جاوداں ایک بسر و چشم حاضر ہوتا مگر آہ، میں اپنی زندگی کے کسی لمحہ کا مالک نہیں ہوں اور میرا یہاں آنا بھی اُسی ذات کی تلاش و جستجو میں ہوا تھا جس کے جنبش مژگاں کے ہاتھ میں اپنا سارا وجود بیچ کر چکا ہوں، میں کس درجہ نادم ہوں کہ مجھ سے اپنے محسن زادی کی تعمیل ارشاد نہیں ہو سکتی۔ میری مجبوریاں اگر آپ کے لئے باعث تکلیف ثابت ہوئیں تو اس میں کلام نہیں کہ میری روح مجروح کے لئے ایک اور زخم کاری کا اضافہ ہوگا، لیکن میں اس کو بھی برداشت کروں گا اور اگر آپ نے اس غلطی کو معاف فرما دیا تو نہایت مسرت کے ساتھ، اور اگر یہ خطا قابل عفو نہ سمجھی گئی تو اپنی ہستی بتا ذی کے ساتھ آپ لوگوں کی مہمان نوازیوں ذرہ نوازیوں کی یاد دلوں میں لے کر چلا جاؤں گا۔ اگر آپ کو میری پہلی تحریر سے کوئی غلط گمان قائم کرنے کا موقعہ ملا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ خدا کرے آپ اس کو یاد رکریں"

خادم

.........

اس تحریر کو پڑھ کر رقیہ کی جو حالت ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے اور جتنا صدمہ اس کو پہنچا ہوگا، اس کا اندازہ صرف تجربہ پر منحصر ہے۔ مگر افضال کے اس جواب سے بالکل مایوس ہو جانا بھی اس کی فطرت کے خلاف تھا کیونکہ جس کام میں وہ زیادہ عاجز ہوتی اس کے لئے وہ اتنی ہی قوت بھی صرف کر دیتی چہ جائیکہ ایسے معاملہ میں جس پر اس کا جینا مرنا منحصر تھا۔ اس نے اپنی تحریر میں افضال سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ مل لے اور یہ صرف اس خیال سے کہ کم از کم ایک بار وہ بھی تو دیکھ لے کہ آیا وہ قابل التفات ہے بھی یا نہیں۔ عورت معاملات محبت میں جس قدر جلد نتیجہ پر پہنچ جایا کرتی ہے اتنی ہی خلش اس کو اس بات کی بھی رہتی ہے کہ اگر میں کسی کو چاہتی ہوں تو وہ بھی مجھے ضرور چاہے اور اسی لئے اس کی خواہش تھی کہ افضال اس کو دیکھ لے کیونکہ وہ اپنے پندار و یقین میں اس کو سمجھ چکی تھی کہ یہ ممکن نہیں اک دفعہ تبادلۂ نگاہ کے بعد افضال اپنے قلب کو ویسا ہی ساکن اور مطمئن لے جاوے گا۔ مگر افضال کی تحریر سے اس کا غرورِ حسن کچھ برہم و متاثر ہوا کیونکہ وہ فی الحقیقت جائز طور سے اپنے تئیں اس کی آغوش میں سونپنا چاہتی تھی اور افضال کی تحریر سے اک رکیک شبہ پیدا ہو رہا تھا۔ غرضکہ رقیہ نے اپنے ذہن میں اک قطعی فیصلہ کر لیا اور میز کے پاس جا کر ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور لفافہ میں بند کر کے زہرہ کو بلا کے دیدیا۔

مظفر، نہایت روشن خیال مقتدر مسلمانانِ بمبئی میں سے تھے، وہ جس قدر ضروریات زمانہ کے لحاظ سے یورپی طرز معاشرت کے پیرو تھے، اسی قدر وہ اپنے مذہبی اصول کے بھی پابند تھے، اپنے خاندان میں یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے یورپ جا کر تعلیم حاصل کی اور پھر واپس آکر خاص اپنے گھر میں اس کو رواج دیا، ان کے

اولاد نرینہ نہ تھی، صرف تین لڑکیاں تھیں جن میں سے دو کی شادی وہ کرچکے تھے، سب سے چھوٹی رقیہ صرف ایک رہ گئی تھی جس کو علاوہ اُردو، فارسی کے، انگریزی کی بھی تعلیم ضروری دلائی گئی تھی۔ لڑکیوں کے شادی کے متعلق اُن کا خیال اور زیادہ وسیع تھا، اور وہ اس بات کے سخت مخالف تھے کہ زبردستی رشتۂ مواصلت قائم کردیا جاوے عام اس سے کہ زن و شوہر میں تطابق مزاج ہو یا نہ ہو، اس بارہ میں اُنھوں نے اک حد تک لڑکیوں کو آزادی دیدی تھی، چنانچہ زاہدہ و عابدہ کی شادی اُنھوں نے انھیں کے رجحان طبیعت کے موافق کی تھی۔ رقیہ چونکہ سب سے چھوٹی لڑکی تھی اور یہی اب ایک گھر میں رہ گئی تھی اس لئے والدین کی نگاہوں میں بہت زیادہ عزیز تھی اور علاوہ اس کے اپنے حُسنِ ظاہری اور سلیقہ و تمیز کے اعتبار سے بھی وہ بے انتہا محبت کئے جانے کے قابل تھی۔

رات کو مظفر، رقیہ کی تحریر ہاتھ میں لئے ہوئے، دورانِ گفتگو میں رقیہ کی والدہ شمس النسا بیگم سے یہ کہہ رہے تھے کہ "میرے خیال میں اس سے بہتر شخص ملنا ناممکن ہے، میرا خیال اُسی دن قائم ہو گیا تھا جب میں نے اُسے دیکھا تھا، لیکن اب رقیہ سے معلوم ہوا کہ باعتبار خصائل و شمائل کے وہ مجسم سنجیدگی و متانت ہے، رہی صورت و شکل اُس کے بابت اب ذکر کرنا ہی فضول ہے، رقیہ اُس کو دیکھ ہی چکی ہے۔ بہرحال میں آج ہی کل میں کسی عنوانِ شائستہ سے افضال سے استمزاج کرونگا، رقیہ کو کسی ذریعہ سے تم مطلع کردو۔" افضال اب تک مظفر منزل کو اپنے قیام سے مفتخر بنائے ہوئے ہے، اور جھنجھلا رہا ہے کہ آخر کب تک یوں ہی پڑا رہوں گا، بارہا میں نے جانے کے لئے اصرار کیا، حرج تعلیم کا بہانہ پیش کیا، مگر بجائے اس کے

کی اجازت ملتی، دو دن سے میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاطر مدارات میں اور اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ سوائے اس کے اب اور کوئی تدبیر نہیں کہ کسی دن بلا اطلاع چل دوں، اگر چہ وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے، رقیہ کا جھگڑا الگ اور نیا خلجان ہے، خدا معلوم وہ کیا سمجھتی ہوگی۔ میری تحریر کا جواب نہیں دیا، غالباً وہ جان گئی ہے کہ میں اس کے لئے بالکل بیکار ہوں، مگر کم از کم میرا فرض اس قدر ضرور ہے کہ مظفر صاحب کو کسی ذریعہ سے اطلاع دیدوں کہ اب رقیہ کا زیادہ گھر میں بٹھا رکھنا مناسب نہیں ہے۔ وہ اسی ادھیڑبن میں تھا کہ رمضانی آیا اور بولا:۔

"سرکار نے یہ چٹھی دی ہے اور کہہ گئے ہیں کہ میں اب شام کو واپس آؤں گا اس کا جواب لکھ رکھیں" اس کے چلے جانے کے بعد افضال نے لفافہ چاک کیا اور یہ عبارت پڑھی:۔

"مائی ڈیر افضال"

مجھے نہایت شرمندگی ہے کہ اس وقت تک تمہاری خاطر تواضع کا حق مجھ سے پورا ادا نہیں ہو سکا، امید ہے کہ تم اس کو میری عدیم الفرصتی پر محمول کر کے معاف کر دو گے، تم مجھ سے اپنے چلے جانے کے بابت اصرار کرتے ہو اور میں تم کو اجازت نہیں دیتا، میں تمہارے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا کہ تم نے بلا اجازت چلے جانے کی کبھی جرأت نہیں کی، تمہاری قابلیت، تمہارا حسن خصائل، تمہارے متین و سنجیدہ اطوار نے جیسا مجھ کو متاثر اور گرویدہ بنا لیا ہے، وہ کسی طرح الفاظ میں نہیں آ سکتا اور اس لئے اگر میں احسان مندی میں تم کو کبھی بیدار دیکھنا چاہوں، تو کیا میرا ارادہ نکوہش ہوں؟ گو مجھے اس امر کا یقین ہے کہ تم بھی مجھے اپنا عزیز دوست سمجھتے ہو، اور اس لئے میرے

جانب سے تم کبھی ایسی بات کی توقع نہیں رکھ سکتے جو تمہاری طبیعت کے منافی ہو تاہم

ضرورت ہے کہ اک معاملۂ خاص میں میں خود تمہارے مُنہ سے تسلیم و رضا کے الفاظ سنوں۔

رقیّہ، میری چھوٹی لڑکی جس کی عمر اب ۱۶ سال کی ہے اور علاوہ اُردو فارسی کے

انگریزی سے بھی بقدر ضرورت واقف ہے، میں چاہتا ہوں کہ اُس کی زندگی کو تمہاری خدمت

کے لئے وقف کر دوں۔ امید ہے کہ انکار سے میرا دل نہ دکھاؤ گے اور اس کے متعلق جو

کچھ خدشات تمہارے قلب میں پیدا ہوں گے ذریعہ تحریر مجھ سے صاف کر لوگے۔

تمہارا ہمیشہ

مظفر

واقعات کے چہرہ سے نقاب اُلٹ دیا گیا تھا، اور افضال اس وقت تپشِ نظارگی سے اپنی کشادہ، متحیر آنکھوں کو مضطرب تخیلات کا محل دیکھ رہا تھا۔ وہ ابرو اور پیشانی دبا دبا کر غور کرتا تھا مگر اُس کا ہر تامل اُس کے جذباتِ قلب کو آلانا گوار خدشۂ ہستی سے خائف کر کر کے تخیل کی اُس حد تک پہنچا رہا تھا جہاں اُس کی آرزوئیں خون میں نہائی ہوئی رنگین نظر آتی تھیں وہ سمجھنے لگا تھا کہ یہ خاطر داریاں، یہ رقیّہ کی جسارتیں، اُس کے روکنے کی یہ محبت آمیز کوششیں، یہ ساری خودغرضیاں اسی واسطے تھیں کہ وہ مقید کر لیا جائے، اک ریشمی ڈور سے اُس کو پھانسی دی جائے ان بے طلب احسانات پر وہ اپنی قربانی چڑھا دے۔ غیر ممکن، محال افضال نہایت مضطرب قدموں سے۔ ہاتھ باغ کی ایک روش پر ٹہل رہا تھا اور اُس کا قلب و دماغ ان تخیلات سے ایسا معمور تھا کہ آفتاب غروب ہو گیا، تارے نمودار ہو گئے، طیور درختوں پر شیشوں کے خیر مقدم میں نعرہائے مسرت سے فارغ ہو کر خاموش ہو گئے

مظفر منزل برقی روشنی سے جگمگا اٹھا، مگر اس دیوانہ تاثرات اس وارفتہ حیات کو
یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ اس وقت اسے یہ مقام مظفر منزل کی خواتین کے لئے چھوڑ دینا
چاہیئے تھا۔ باغبان اک کونہ میں منتظر تھا کہ دروازہ بند کر دوں، کھڑکیوں سے
اس وقت یہاں کی سیر کرنے والیاں دیکھ دیکھ کے دل ہی دل میں مسکرا رہی تھیں
کہ اگر آدمی بدحواس ہو تو کم از کم اتنا تو ہو۔ خاکی کرتہ پہنے ہوئے، اس کی بھی آستینیں
شانہ تک چڑھی ہوئیں، برہنہ سر، پاؤں میں سلیپر ڈالے ہوئے ابھی افضال
محو خرام ہی تھا کہ زہرہ آئی اور کوٹ لا کے دیا کہ "سرکار نے بھیجا ہے کہ سردی
معلوم ہوتی ہوگی اور آپ کو یاد کر رہے ہیں" افضال ٹھٹک گیا متحیر کھڑا ہو گیا،
ادھر ادھر نگاہ اٹھا کے وقت پر غور کیا تو کچھ محجوب بھی ہوا۔ کوٹ لے کے پہننے لگا
اور سوچنے لگا کہ جانا مناسب ہے یا نہیں۔ اس نے اتنا وقت اس کے پہننے میں
صرف کر دیا کہ آخر اک رائے قائم کر کے اس نے زہرہ سے کہا کہ "اچھا تم ٹھہرو،
میں ٹوپی پہن کے آتا ہوں" زہرہ نے دوسرے ہاتھ سے اک غیر محسوس تبسم کے
ساتھ ٹوپی بھی حوالہ کی اور خاموش کھڑی رہی۔ افضال نے بلا کسی اصول کے
یوں ہی سر پر رکھ لی اور زہرہ سے کہا کہ "بڑھو" وہ اپنے میں اس وقت بہت ہمت
پاتا تھا اور خوش تھا کہ میں اپنی کج خلقی سے اس وقت ان مصائب کا خاتمہ کر دوں گا
اور صبح کو انشاء اللہ چلا جاؤں گا۔

باغ کے شمالی حصہ کے اختتام پر مظفر منزل کے زینوں کو طے کر کے، افضال
ایک خوشنما آراستہ کمرے میں مظفر صاحب کا انتظار کر رہا تھا کہ سامنے کے دروازہ
سے پردہ ہٹا کر اک سیاہ برقعہ متحرک نظر آیا اور سامنے کرسی کے پاس آ کر

قائم ہوگیا۔ **افضال** اک فوری تخیل سے متاثر ہو کر بھاگ جاتا، مگر اُس نے چاند کو سیاہ بادلوں سے نکلتے ہوئے کبھی اس درجہ دلکش انداز سے نہیں دیکھا تھا جیسا اس وقت اُس نے رقیہ کے صبیح چہرے کو برقعہ سے جدا نظارہ کیا۔ اس کی پنڈلیاں کانپنے لگیں اور اک دفعہ تھرتھرا کے آنسو کی طرح پھر کرسی پر گر پڑا اور آگے میز پر کہنیاں ٹیک کے ہاتھوں سے سر کو تھام کے، گردن جھکا کر خاموش ہوگیا۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا، گلا خشک ہو رہا تھا اور اُس کو مطلق ہوش نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ پورا آدھ گھنٹہ ان دونوں تصویروں کو سر جھکائے ہوئے ہوگیا۔ اور کوئی لفظ کسی کے منہ سے اس کمرہ کی ساکن فضا کو متحرک کرنے کے لئے نہ نکلا۔ **افضال** اب موجودہ حالت سمجھنے کے لئے ہوش میں آگیا تھا، اور حواس میں آنے کے بعد سب سے پہلی چیز جس کو اُس نے محسوس کیا وہ میز کا رعشہ تھا اور سب سے پہلی چیز جس کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں منفعل ہوگئیں، وہ میز کی چادر کا وہ خوش نصیب حصہ تھا جو رقیہ کے گلاب اشک سے معطر بنا ہوا تھا۔ **افضال** ایسا نازک و رقیق قلب رکھنے والا، اس ہلاکت سے بچنے کے لئے اور کوئی چارہ نہ رکھتا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ ایسے مقام آزمایش، ایسے محل ابتلا سے چلا جائے، مگر آہ، حسن نے اُس کے مٹانے اور برباد کرنے کی قسم کھائی تھی، وہ اٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ رقیہ اُس کے قدموں پر تھی۔ **افضال** کے ہاتھ کا اُس کے جسم میں لگنا تھا، کہ رقیہ اُس کی گود میں تھی، اور رقیہ کے پرجوش و سحر طراز سینہ سے **افضال** کے سینہ کا مس ہونا تھا کہ وہ فرش زمین پر بیہوش پڑا تھا۔

کمرہ چاروں طرف سے بند تھا، **افضال** کے جسم سے کوٹ، اور رقیہ کے

بدن سے برقعہ جُدا تھا، اس کا گریبان کھُلا تھا، اُس کا ڈوپٹہ شانوں سے ڈھلا ہوا
تھا، ایک بیہوش تھا، تو دوسرا بھی اپنی رسائی قسمت پر غش تھا، **افضال** لیٹا تھا
اور اُس کا سر رقیّہ کے زانو پر تھا، رقیّہ بیٹھی تھی اور رومال سے اُس کی پیشانی کا پسینہ
پونچھ رہی تھی۔ اب اس سے زیادہ حُسن کی فتح اور کیا ہوسکتی ہے۔ آدھ گھنٹہ تک
رقیّہ جس طرح اُس کا جی چاہا اس حُسن بیہوش سے لطف اُٹھاتی رہی اور ایسی مستغرقِ مسرت
رہی کہ اُس کو ذرا بھی فکر اس بات کی نہیں ہوئی کہ کسی طرح یہ ہوش میں تو آجائے اپنے
آنچل سے ہوا دیتی جاتی تھی اور پیشانی پر آپڑنے والے بالوں کو اپنی حنائی اُنگلیوں سے
ہٹا ہٹا کر اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اُس کی جسم کی حدت کو دیکھتی جاتی تھی۔ تھوڑی
دیر بعد **افضال** نے اپنی ناتواں اور مضمحل آنکھیں کھولیں اور اپنی حالت کو دیکھ کر فوراً
یہ کہہ کے بیٹھ گیا "آپ کیوں مجھے محجوب و برباد کر رہی ہیں؟ جس شخص کی جان اور ساری
زندگی آپ برباد کریں، کیا اُس کو اس قدر محجوب کرنے کا بھی حق حاصل نہیں ہے" رقیّہ
نے جواب دیا۔ **افضال** اُٹھا اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور رقیّہ بھی قریب ہی کرسی
سرکا کے اُس سے آڑ لگا کے کھڑی ہوگئی، نہ اُس کو اس وقت بے پردگی کا کچھ خیال
تھا اور نہ اپنی ناموس کا، وہ بالکل مبہوت تھی اور اپنی زندگی کا آئندہ فیصلہ سُننے
کے لئے کھڑی تھی۔ اُس کا عنفوانِ شباب ایسا معمولی دیباچہ حُسن و رعنائی
نہ تھا، جس کو دیکھ کر آدمی وارفتہ نہ ہوجاتا، چہرہ اُس دلربا ساخت کا تھا جس کا
نمونہ کیوپڈ کو اپنے تیر و پیکان سنبھالنے پر زمانہ پیشین میں مجبور کر دیتا تھا۔ آنکھیں
جو آنسوؤں سے دُھل سی گئی تھیں، تو نگاہیں کچھ ایسی ہلکی اور سبک ہوکر نکل رہی
تھیں، جس سے پناہ ڈھونڈھنے کے لئے **افضال** کا قلب تمق سینہ میں چھپ رہا

ہو رہا تھا، وہ رقیہ کے چہرہ کو دیکھتا تھا مگر بلوری پیشانی پر حلقہائے زلف کے
اندازِ شکستگی سے، اُس کا نظارہ کانپ اُٹھتا تھا، وہ رقیہ کے پھول سے رخسار و لب
سے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو تسکین دینے کی خواہش اپنے قلب میں پاتا تھا لیکن
وہ ان تیغہائے ابرو سے خائف تھا جو دنبالۂ چشم سے مصروفِ غمازی نظر آتے
تھے۔ وہ نازک لبوں، ان ہلکی ملفوف پنکھڑیوں کی تازگی سے مسرور ہونا چاہتا
تھا، مگر وہ ڈرتا تھا کہ کہیں نگاہ پڑتے ہی یہ کھل نہ جائیں اور پھر نظر سوز بجلیوں سے
تصادمِ نگاہ ہو جائے۔ افضال اُس کے گول متناسب اعضا، اُس کی لانبی
گردن، اُس کی کشیدہ قامتی، اُس کے مسکراتے شباب اور اُس کی اس محبت پاشی سے
اس درجہ متاثر ہوا کہ اُس کو آخر یہ پوچھنا ہی پڑا کہ "آپ کا مطلب کیا ہے"، رقیہ
اس ہمت خیز گفتگو سے اس درجہ مسرور ہوئی کہ وہ اپنے جذبات کو کسی طرح نہ روک سکی
اور بے اختیار افضال سے لپٹ کے رونے لگی۔ وہ پھر اپنی حالت متغیر پاتا تھا،
لیکن اُس نے بہت ضبط کیا اور سنبھل کے اُس نے رقیہ کے سر کو ہٹایا اور اُس کی
گردن ایک ہاتھ سے اُٹھا کے مضطربانہ اپنے لبوں کو اُس کے لبوں سے ملا دیا۔
حریف مغلوب ہو گیا، مقابل نے ہتھیار ڈال دئے اور اپنے مفتوح اور مالوف
ہونے کا اقرار خود اپنے لبوں سے کر لیا۔ آہ، اب افضال نازکن نہیں تھا،
بلکہ نازکش تھا، اب اُس سے التجا نہ کی جاتی تھی بلکہ خود ملتجی تھا، زانو پر لٹا کے اب
کوئی اُس کا حق چھین نہ تھا، بلکہ وہ خود اپنے متکر ہاتھوں سے آنسو پونچھ رہا تھا،
وہ کہہ رہا تھا کہ "مجھے کوئی عذر نہیں"، لیکن اب اس کی وہاں شنوائی نہ تھی، وہ تسلیاں
دے رہا تھا، وہ نہایت پُرجوش الفاظِ محبت سے رقیہ کو خاموش کرنا چاہتا تھا،

مگر آہ، اُس کی آنکھوں کو تو **افضال** کا سارا دامن تر کرنا تھا، اس پانی سے اُس کے
سینہ کی آگ کو اچھی طرح مشتعل کرنا تھا، وہ کیونکر باز رہتیں۔ **افضال** قسمیں کھا کھا کر
پیمانِ وفا باندھ رہا تھا، حلف اُٹھا اُٹھا کر عہد الفت کو مستحکم کر رہا تھا، مگر رقیہ بیوقوف
نہ تھی، وہ اس فرصت و کامیابی سے پورا نفع اُٹھانا چاہتی تھی، وہ موجِ نشاط
میں مستغرق تھی اور کوئی تدبیر اُس کی اس مضطرب مسرت کو آشنائے سکون نہ کرتی
تھی۔ گو **افضال** اپنے تئیں نہایت مستحکم مزاج سمجھتا تھا، مگر یہ بھی اُس کے شباب کا
دھوکا تھا، اُس کے جذبات کا فریب تھا، وہ ہمیشہ آمادۂ ہلاکت تھا اور اس لئے
اُس کا انتخاب خنجر و شمشیر بالکل بیکار تھا۔ اُس کا آبلۂ دل صرف حرکت نشتر چاہتا تھا
اور وہ اُس کو مل گئی، اب وہ کوشش کر کے بھی ان بکھر جانے والی تمناؤں، ان
کھل پڑنے والی امیدوں، ان منتشر ہو جانے والی آرزوؤں کو اکٹھا نہ کر سکتا تھا
وہ رقیہ سے پہلے ملنا نہ چاہتا تھا، مگر جب دیکھ لیا تو اُس سے ملنے کی خواہش پیدا
ہوئی، اور جب مل گیا، تو فوراً ہی اُس کی پرستش کرنے لگا، آہ، حمیدہ کے ساتھ
اُس کی گرویدگی اک سرابی جذبہ تھا لیکن اگر وہ مل جاتی تو اس میں کلام نہیں کہ
یہ وہیں فنا بھی ہو جاتا، کیونکہ اس کی ربزش سجدہ تو اک آستانہ تلاش کر رہی تھی
اور وہ رقیہ کی وجود میں اُس کے پیش نظر ہو گیا۔ رقیہ خوب رو چکی، اچھی طرح
رُلا چکی تو جدا ہوئی، مگر ہائے ابتدائے گریہ میں وہ طالب تھی اور انتہائے گریہ
میں مطلوب، پہلا آنسو اُس کے آنکھ سے سراپا نیاز ہو کر نکلا تھا اور آخری اشک
سراپا ناز ہو کر، اپنے سینہ کو تمناؤں سے خالی کرنے کے لئے بڑھایا تھا، مگر جب واپس
لائی تو وہ **افضال** کی آرزوؤں سے بھی معمور نظر آتا تھا۔ رقیہ بیٹھی تھی اور پندارِ حسن

کا رنگ اُس کی نازک جلد کے نیچے جھلک رہا تھا، وہ حرکت کرتی تھی اور اداؤں میں کچھ افتخار خودداری بھی ممزوج نظر آتا تھا، جو آنکھیں پہلے حریص و بے محابا تھیں، وہ اب مژگاں کے اوٹ سے بھی سامنے نہ ہوتی تھیں، جو ابروئیں پہلے ترحم انداز سے جھکی ہوئی تھیں اب اُن سے خواستگاری رحم کی جاتی تھی اور وہ کھنچی ہوئی تھیں۔ جن لبوں سے پہلے ملتجی الفاظ نکلتے تھے، وہ اب التجا طلب تھے، جو نگاہیں پہلے متمنی اُٹھتی تھیں وہ اب تمنا خیز تھیں۔ پہلے رقیہ کو اپنے سینہ و شانہ کے عریانی کی بھی خبر نہ تھی اور اب وہ اپنی کلائیاں بھی پوری طرح **افضال** کو نہ دکھانا چاہتی تھی۔ پہلے یہ روٹھے ہوئے کو منا رہی تھی اور اب یہ بگڑی ہوئی تھی اور اسے کوئی منا رہا تھا۔

صبح کو جب **افضال** سو کر اُٹھا، تو وہ مردانہ خانہ میں نہ تھا، بلکہ زنان خانہ میں تھا، رمضانی اُس کی خدمت میں حاضر نہ تھا بلکہ زہرہ تھی، مولوی مظفر اُسکے پاس نہ تھے، بلکہ رقیہ اُس کے پہلو میں تھی، وہ صرف **افضال** نہ تھا، بلکہ رقیہ کا شوہر اور مظفر صاحب کا عزیز داماد تھا۔

شامِ انتظار، شبِ امید کی لذتیں کیئے یا تکلیفیں وہ اُٹھا چکا تھا اور اب وہ صبحِ وصال کی مسرت میں ڈوبا ہوا تھا، رقیہ حیاتِ تخیل کی شبیہ، لذاتِ منفعل کی تصویر بنی ہوئی **افضال** کے روبرو بیٹھی تھی، اور جھکی ہوئی نگاہیں مائل نشیب مژگاں سے ملی ہوئی، دفترِ ندامت کا شیرازہ بنی ہوئی تھیں، آنکھوں میں پھیلا ہوا سرمہ، دودِ مستی بنا ہوا صحبتِ دوشینہ کی پُرکیف دقیقہائے مسرت پر روشنی ڈال رہا تھا، لبوں کی پپڑائی ہوئی سرخیاں، ملی دلی پنکھڑیوں کی طرح مرجھائی ہوئی نظر آتی تھیں، اُس کا کندنی رنگ رات بھر کی حدتِ آغوش سے اور بھی

دہکنے لگا تھا، اُس کے رخساروں کا شہاب بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب ٹپکنا ہی چاہتا ہے، چہرہ کی نازک رگوں میں تبسّم دوڑ رہا تھا، مگر آنکھوں تک آکر اس کھلی ہوئی آغوشِ ندامت میں پہنچ کر خدا معلوم کہاں غائب ہو جاتا تھا، گو شب کا تکان اب بالکل رفع ہو گیا تھا، لیکن نیم وا آنکھیں، ہائے یہ وہ مست جمائیاں تھیں جو عشرتکدۂ دوشینہ کے خمارِ لقبیہ کی غمّازی ہوتی تھیں۔ **افضال** پر جو کچھ اس آٹھ گھنٹہ کی شب میں گذرا، وہ بلا شبہ اُس کے لئے پہلی بلا سے کامرانی تھی، اور اس لئے نہایت صمیمی شوق کے ساتھ اس سرمستیِ آلام کی اُس نے پذیرائی کی ہوگی، لیکن جو لطف وہ صباحِ وصل کی اداؤں سے اُٹھا رہا تھا، وہ بیشک اُس کے وجودِ شعری کے لئے اک ناقابلِ بیان لذّت تھی۔ یوں تو اُس نے ہمیشہ پانوں کا خوت کیا، لیکن اس وقت رقیّہ کا شرمائے ہوئے ہاتھوں سے گردن جھکا کے تھالی سرکا دینا، اور منہ سے کچھ نہ کہنا، ہائے یہ وہ نظارہ تھا جس کا تخیّل ہی **افضال** کی دیوانہ سری کے لئے اک ہو رہا تھا، چہ جائیکہ اُس سے یوں بے محابا لذّت یاب ہوتا۔ وہ بالکل کھویا ہوا تھا، وہ مطلق اپنے ہوش میں نہ تھا، وہ اک وارفتگی تھا طویل، وہ اک بیہوشی تھا غیر منقطع رقیّہ اُٹھ کر چلی گئی اُس کو خبر نہ ہوئی، زہرہ کئی بار آئی گئی اُس کو علم نہ ہوا، کھانے کا وقت آ گیا اور یہ رمز شناسِ محبت اسی طرح کرسی پر بیٹھا ہوا اپنے تخیّلِ لذات سے مزہ اُٹھاتا رہا۔ صبح کی ڈاک کے اخبارات جب میز پر سامنے لا کے ڈالے گئے تو یہ چونکا اور یونہی کیف خیال کے ایک اخبار اُٹھا کر دیکھا تو سرورق ہی پر یہ اعلان اُس کی نگاہ سے گذرا۔

# مسٹر افضال

جہاں کہیں بھی ہوں، وہ لکھنؤ آکے جلد اُس امانت کو صاحب امانت کے سپرد کردیں جس نے اُن کو ترکِ دُنیا پر مجبور کردیا ہے۔

حمیدہ نمبر ۱۶ امین آباد پارک

اخبار ہاتھ سے چھوٹ گیا، زمین پیروں کے نیچے سے نکل گئی، اور افضال سر پکڑ کر خاموش رہ گیا۔ اُس کا جنونِ اولین جو رقیہ کے حُسن کے رگڑوں سے مٹ سا گیا تھا، پھر سامنے آگیا، لیکن ملامتیں لئے ہوئے، اگلے جذبات پھر اُسکے دماغ میں گنجایش ڈھونڈھنے لگے، مگر نکوہش و سرزنش کے ساتھ۔ وہ تاویلیں کررہا تھا کہ رقیہ حمیدہ سے زیادہ حسین ہے، اُس سے زیادہ قابل و سمجھدار ہے، اُس سے کہیں بڑھکر اس میں دلربائیاں ہیں، لیکن اخیر میں یہ سب تاویلیں رد ہوجاتی تھیں جب وہ حمیدہ کے حقوقِ دیرینہ اور اپنے معاہدۂ اوّلین پر نگاہ کرتا تھا۔ گو وہ رقیہ سے وابستہ ہونے پر نادم نہ تھا کیونکہ فی الحقیقت اُس کو رقیہ سے شغف ہوگیا تھا اور وہ بھی اسی قابل، مگر اک الجھن تھی، اک نامعلوم تکلیف تھی جو اُسے بےچین بنارہی تھی اُسکو حیرت تھی کہ اُس کو کیونکر میرا نام و پتہ معلوم ہوگیا اور وہ لکھنؤ آخر پہنچی کس طرح۔ کیا رقیہ سے سب حالات کہدوں اور اُس سے مشورہ طلب کروں؟ مگر وہ ہرگز جانے کی اجازت نہ دیگی اور کیونکر دے سکتی ہے، پھر کیا کروں؟ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رقیہ بھی آگئی اور آتے ہی اُسی کھلے ہوئے اعلان پر نگاہ پڑی۔ اگر افضال کے سینہ میں شعلہ تھا، تو رقیہ پر بجلی گری تھی، اگر وہ صرف کبیدہ خاطر تھا تو یہ سخت بےچین و مضطرب تھی۔

افضال اب اُس سے چھپا نہ سکتا تھا۔ اُس نے بتلا دیا اور اُسی کے راے پر چھوڑ دیا اور گو اُس وقت کوئی فیصلہ نہ ہوا، مگر شام تک اک قطعی راے قائم کر لی گئی اور اُس پر فوراً عملدرآمد بھی کیا گیا۔

(۸)

افضال، یہ سیاح محبت کامل ایک ماہ کے بعد پھر وہیں جارہا تھا، جہاں اُس کو پہلا درسِ عشق دیا گیا تھا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ جب وہ گیا تھا تو اک بیتاب و حزیں سینہ لے کر گیا تھا اور اب واپس آتا ہے تو پُرسکون و شاد کام قلب لے کر آتا ہے۔ گو اُس کو کوئی حق حاصل نہ تھا کہ وہ حمیدہ کے پیدا کیے ہوئے جذبات رقیہ کے مسرور کرنے میں صرف کر دیتا، اور گو یہ انصاف و مروت سے بعید تھا کہ جو سودا وہ حمیدہ سے کر چکا تھا اُس سے انحراف کر کے بیعت شکن ہوتا، مگر ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ وہ اپنے حسیاتِ تند سے مجبور تھا۔ وہ اک آنسو تھا جو نوک مژگاں پر آ کر تھرتھرا رہا تھا، ذرا سی جنبش، خفیف سی ہمدردی اُس کو منتشر کر دینے کے لیے کافی تھی، اور یہ محض اتفاق تھا کہ رقیہ کو اپنے دامنِ دل تر کرنے کا موقعہ اُس سے مل گیا لیکن حمیدہ کا پتہ معلوم ہونے کے بعد اور خاصکر اُس کے طلب کرنے پر خاموش رہنا بھی اُس کی طبیعت کے خلاف تھا۔ وہ اعلان دیکھتے ہی روانہ ہو جاتا، مگر رقیہ کو بھی اس آہوئے تازہ مجروح کے ساتھ جاتا تھا کہ مبادا کوئی دوسرا قادر انداز، ناوک فگن اُس پر قابو پا جائے، اس لئے ۵-۶ روز کی دیر ہو گئی۔

افضال اک متوسط الحال آدمی تھا، اور اُس کی آیندہ تعلیم و تکمیل بہت سی آرزوئیں خاندان کی منحصر تھیں، اس لئے وہ زاید تعیشات زندگی، اور آرائشات تن

کا عادی نہ تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس لحاظ سے بہت محدود ضروریات اور نہایت مختصر تمناؤں کا آدمی تھا، مگر اب وہ اک دولتمند بیرسٹر کی عزیز لڑکی کا نہایت محبوب شوہر تھا اور اس لئے اوعائے فطرت کے خلاف انتہائی اصرار کے ساتھ ان سب تکلفاتِ زندگی کا خوگر بنایا جا رہا تھا۔ حضرت گنج میں اک شاندار کوٹھی اُن کے قیام کے لئے آراستہ کی گئی تھی، متعدد خدام حضوری میں تھے، مختلف مذاق و تہذیب کی گاڑیاں اُن کی تفریح کے لئے مہیا کی گئی تھیں اور اس شان کے ساتھ یہ قران السعدین اپنا زمانۂ ہنی مون (honey-moon) لکھنؤ میں بسر کرتے آ رہا تھا۔

افضال نہایت شوق کے ساتھ لکھنؤ کے طرف چلا اور جیسے ہی شام کو اترا تو نہایت اضطراب کے ساتھ وہ صبح کا انتظار کرنے لگا اور جب صبح ہوئی تو اُسے اک کششِ معلومہ نے امین آباد پارک جانے پر طیار کر دیا۔ رقیہ، افضال کی اس بیچینی کو محسوس کرتی تھی اور کبیدہ ہو رہی تھی کہ اُس کو کسی دوسرے کے لئے اس درجہ بیتاب نہ دیکھے، وہ ڈرتی تھی کہیں حمیدہ کا حُسن بیباک اس کو چھین نہ لے اور اس لئے لطائف الحیل سے اُس کے جذبات کو روکنا چاہتی تھی۔ اُس نے کہا "میری رائے میں آپ کو پہلے اپنی آمد کی اطلاع حرف تحریر کے ذریعہ سے کر دینا چاہئے کہ وہ خود یہاں تشریف لاویں، یہ تو معلوم ہی ہو گیا ہے کہ اُن کو آپ کا پتہ کس طرح معلوم ہوا، رہی اُن کی امانت، اُس کا واپس پہنچا دینا بھی بغیر گئے ممکن ہے، مگر آپ کو شاید اس امر کے دریافت کی بھی فضول زحمت گوارا کرنا ہے کہ وہ کون ہیں۔ تو اس کے لئے بھی زیادہ مناسب یہی ہے کہ اُن کو خود یہاں تکلیف دی جائے۔ ان کی معاشرت موجودہ کی لحاظ سے یہ گمان تو ہو ہی نہیں سکتا

کہ ان کو یہاں آنے میں کسی نوع کا تکلف ہوگا، پھر کیا حرج ہے کہ آپ کی وجہ سے میں بھی ایسی روشن خیال خاتون کی صحبت سے بہرہ اندوز ہو لوں" یہ حجت گو نئی نہ تھی اس سے قبل بھی افضال پر اسی بات کا زور دیا گیا تھا، وہ چاہتی تھی کہ حمیدہ کو پہلی ہی ملاقات میں معلوم ہو جائے کہ وہ رقیہ سے وابستہ ہو چکا ہے، اور اسی خیال سے افضال حمیدہ سے رقیہ کی عدم موجودگی ہیں ملنا چاہتا تھا اور اکبارگی اس علم سے اُس کو دلگیر نہ کرنا چاہتا، کیونکہ اُس کے مذہب میں جنس لطیف کے مغموم کرنے سے زیادہ اور کوئی گناہ نہ تھا۔ وہ رقیہ کی اس نگاہِ مصلحت اندیش کو خوب سمجھتا تھا اور چونکہ اس میں بھی رقیہ کی انتہائے محبت کام کر رہی تھی اس لئے وہ اُس کے خلاف بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسی تصادمِ شوق و رعایت میں دس بج گئے اور کوئی رائے افضال قائم نہ کر سکا۔ افضال کے واپسی کی خبر تمام اُس کے حلقۂ تعارف میں مشہور ہو چکی تھی اور ہر شخص استعجاب و مسرت کے ساتھ اُس سے ملنے کو آ رہا تھا، اس لئے اب مجبوراً اُس کو جانے کا خیال فسخ کرنا پڑا اور ۲ بجے تک مشکل سے فارغ ہو سکا۔

## (۹)

حمیدہ، شام کو اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی، خدا معلوم کن تخیلات میں مستغرق تھی کہ خادمہ ایک کارڈ لائی، اور اُس کے سامنے میز پر ڈال دیا۔ آہ، برق سراسیمگی پیدا کرتی ہے، مگر اس قدر جلد کہاں، آتش مشتعل ہوتی ہے، لیکن اتنی سرعت اُس میں کہاں۔ حمیدہ گھبرا گئی، اُس کے ہاتھ پیر پھول گئے، مضطربانہ حالت سے اُٹھی اور پھر بیٹھ گئی، بیٹھی اور پھر اُٹھی، اُٹھی اور ٹہلنے لگی، ٹہلتے ہوئے دروازہ تک

گئی اور پھر لوٹ آئی، لوٹی اور کرسی کے پاس آکر پھر کھڑی ہو گئی۔ خادمہ منتظر تھی اور جواب کی منتظر، مگر حمیدہ کے پیر تلاطمِ مسرت میں اُکھڑ گئے تھے اور وہ بالکل بے قابو ہو کر بھی چلی جا رہی تھی، سنبھلتی تھی اور گر پڑتی تھی، گرتی تھی اور پھر قوت کر کے اُٹھتی تھی، کئی منٹ تک وہ اس سیلابِ تمنا کا مقابلہ کرتی رہی اور بمشکل تمام اُس کے زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ "اچھا بلا لو" کہنے کو تو اُس نے کہدیا مگر افضال اندر آگیا اور حمیدہ کی سمجھ میں اب تک یہ نہ آیا کہ کیونکر اُس کی پذیرائی کرے۔ کئی منٹ گذر گئے اور حمیدہ کو یہ علم نہ ہوا کہ دروازہ کے پاس افضال کھڑا ہوا مخاطب کئے جانے کا منتظر ہے۔ گو وہ حمیدہ کے ان تاثرات سے ناواقف نہ تھا، جو حالت حمیدہ کے قلب کی تھی وہ اُس کے نگاہوں میں تھی اور بہ لحاظ فطرت اُس کو بھی اُتنا ہی متاثر ہونا چاہیئے تھا، لیکن رقیہ کی صحبت نے اُسکے قلب کو رُعبِ حسن کے لئے ذرا جری اور باہمت بنا دیا تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے کھڑا ہوا حمیدہ کی کھوئی ہوئی حالت کا اندازہ کر رہا تھا اور محض اس تخیل سے کہ وہی اس کی علت ہے مسرور ہو رہا تھا۔ آخر کار حمیدہ نے مڑ کے دیکھا اور نہایت مضطرب سرعت کے ساتھ آگے بڑھ کے افضال سے ہاتھ ملایا اور ایک کرسی پر اُسے بٹھا کے سامنے خود بھی بیٹھ گئی۔

"میں دیکھتا ہوں کہ میں نے آپ کے سلسلۂ خیالات کو اپنی نامناسب جسارت سے بہت ناگوار طریقہ سے منقطع کیا، میں معافی چاہتا ہوں" افضال نے کہا۔

"نہیں، یہ آپ کیا فرماتے ہیں، میرے لئے اس سے زیادہ مسرت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کے لئے میں اپنا بیکار وقت کام میں لا سکوں، معذرت خواہ میں ہوں کہ شاید آپ کو ضرورت سے زیادہ قیام کرنا پڑا۔ اور میں اپنی اُلجھنوں میں بدقسمتی سے

جناب کی تشریف آوری کو بالکل بھول گئی" حمیدہ نے جواب دیا۔

"یہی تو میں نے بھی عرض کیا کہ آپ اسوقت کسی کام میں اُلجھی ہوئی تھیں اور میرے آنے سے اُس میں حرج واقع ہوا" افضال نے کہا۔

حمیدہ گو نہایت مہذب اور رسمی فقرات استعمال کر رہی تھی اور سُن رہی تھی لیکن اُس کا جی یہی چاہتا تھا کہ بہت جلد اس کو بے تکلف ہونے کا موقع مل جائے اس لئے اس نے فوراً ہی افضال کی گفتگو سے موقعہ نکالکے جواب دیا کہ "اگر یہ سب اُلجھنیں آپ ہی کے دم سے ہوں تو؟" "آہ، تو اور زیادہ مجھے محجوب ہونا چاہیئے کہ صرف میرا آنا ہی نہیں، بلکہ میری ذات بھی آپ کے لئے اس درجہ باعث تکلیف ہے" افضال نے جواب دیا۔ حمیدہ بولی "خیر وہ لمحہ جبات ہیں نے میرے حسِ اولیں کو کبھی مجروح کیا تھا اُس کا شکوہ تو میں گناہ سمجھتی ہوں، لیکن ہاں وہ گلہ مند اضطرار انتظار جو کبھی سے آپ کی تحریر ملنے کے بعد شروع ہوا ہے ضرور آپ کے حضور میں فریادی ہے، اور کیا عجب ہے کہ اس وقت کی میری پریشانیاں کچھ اُنھیں مسرات سے متعلق رہی ہوں، جو اس قدر تعویق، اس درجہ صبر آزما تاخیر کے بعد آپ کے غفلت سرشت وجود میں، مجھ تک پہنچیں، "حمیدہ کے مُنہ سے ایسے حوصلہ افزا، ایسے محبت پاش الفاظ سنکر کچھ سکر کی سی حالت طاری ہو گئی اور ان درد مند نگاہوں کو دیکھکر جو اس گفتگو کے اختتام پر بے اختیار اُس کے ہاتھ اُٹھ کر فوراً پلٹ گئیں، افضال اپنی جگہ پر جنبش کھا کھا کے رہ گیا۔ اس سے پہلے اگر رقیقہ کی نشیلی انکھڑیوں نے اس کو بادہ خوار نہ بنا دیا ہوتا، تو اس میں شک نہیں کہ وہ اس وقت اُلٹ کے دکھ دیتیں یہ سُن کر وہ متاثر ضرور ہوا مگر سنبھل کر جواب دیا "میری

تصدیق، میں اعتراف کرتا ہوں "آپ کے لئے ضرور باعث تکلیف ہوئی، اور اس لئے اس
گناہ کی تعزیر کے لئے میں آمادہ ہوں، لیکن کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے جن پر مجھے قابو
نہ تھا اور اس پر اور طرہ ہوئی میری حماقت کہ میں نے ذریعہ ڈاک آپ کی امانت کو آپ تک
نہ پہنچا دیا جس کے جلد نہ ملنے سے غالباً آپ کا حرج ہوا اور تکلیف ہوئی" یہ کہ کر اس نے
جیب سے وہ خط نکالا اور سامنے رکھ دیا۔ حمیدہ متحیر تھی، سخت متعجب تھی کہ جس شخص
کے نسبت اس کا گمان تھا کہ محض اس کی تلاش میں سرگرداں ہے، سامنے ایسا مطمئن
اور غیر متاثر نظر آ رہا ہے، اسے کیا خبر تھی کہ رقیہ کی وابستگی نے افضال کے بازو پر
اک مہرۂ طلسم باندھ دیا تھا، حسن کی سحر طرازیاں اور فسوں کاریاں کچھ اثر کر سکتی تھیں،
اسے کیا علم تھا کہ اس کا مجروح کیا ہوا شکار کسی دوسرے شکاری کے ہاتھ لگ گیا ہے
اور اس کے ناوکِ نگاہ کا زخم مندمل ہو چلا ہے۔ حمیدہ سمجھتی تھی کہ صرف تبادلۂ نگاہ کی
ضرورت ہے، مگر آہ، تبادلۂ تکلم بھی بالکل بے سود ثابت ہوا۔ وہ اپنی بے اثری سے کچھ
جھنجھلا سی گئی اور بے اختیار اس کے آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے، مگر اس کی خودداری
نے بہت ضبط کیا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے جواب دیا کہ "میں آپ کے اس
حفظِ مکتوب کی ممنون ہوں اور غالباً اتنا ہی فرض آپ پر تھا بھی کہ اگر کبھی کاتب یا
مکتوب الیہ کا پتہ آپ کو معلوم ہو جائے تو اس تک آپ پہنچا دیں، مگر افسوس ہے
کہ مجھ کو آپ کے لکھنؤ چھوڑنے سے جن باتوں کا پُر مسرت گمان ہوا تھا، وہ سب
غلط نکلیں۔ شاید واقعات کے دھوکا دینے کی مثال اس سے زیادہ حیرت انگیز اور
کوئی نہیں ہو سکتی" یہ کہا اور اس خط کو لے کر حمیدہ نے چاک کرنا شروع کر دیا۔ افضال
خوب سمجھ رہا تھا اور نادم ہو رہا تھا مگر اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اپنی موجودہ

حالت کے اظہار سے اُس حسنِ برہم کو اور زیادہ مشتعل دیکھنا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا اور
سوچتا رہا کہ کیونکر اُس کے مفصل حالات معلوم کرے اور آخر کو ہمت کر کے اُس نے
کہا کہ "صرف اس مکتوب کا آپ تک پہنچا دینا ہی میرا فرض نہ تھا، بلکہ میں تو اپنا فرض یہ بھی
سمجھتا تھا کہ جہاں تک میرے امکان میں ہوگا آپ کی پُرغم زندگی کی ہمدردی کروں گا،
اور اگر اسی نوع کا کوئی گمان آپ کو ہوا تھا، تو وہ غلط نہ تھا، اس لئے آپ مجھ کو حکم دیں
اگر تعمیل ارشاد میں مجھے کوئی عذر ہو تو بیشک واقعات قابل الزام ہیں"
گو افضال صراحتہً دلسوزی اور ہمدردی کا وعدہ کر رہا تھا، مگر حقیقتہً وہ اُس
جوش سے معرا تھا، جو حمیدہ کو پُرکیف اور وارفتہ بنانے میں کامیاب ہوتا۔ اُس کے
منہ سے یہ الفاظ سن کے وہ مسرور ہونے کی کوشش کرتی تھی مگر خدا جانے وہ کون سی
غیر معلوم قوت تھی جو اُس کو بتلا رہی تھی کہ یہ ہمدردی نہایت تھکی ہوئی اور سُست
ہے اور اسلئے بجائے اخذ مسرت کے وہ ان الفاظ سے اور مضمحل ہو رہی تھی۔ اُس نے
نہایت غمگین لہجہ میں جواب دیا کہ "میں آپ کے اس دعوائے ہمدردی کی شکر گذار ہوں
مگر افسوس ہے کہ میں اپنی پُرغم داستان سے آپ کو کبیدہ کرنے کی جرأت اپنے
میں نہیں پاتی، اور نہ آپ کو ایسی بات پر اصرار کرنا چاہئیے جس کے لئے فی الحقیقت
آپ طلبگار بھی نہیں، اس لئے مناسب یہی ہے کہ آپ صرف اس علم پر اکتفا کریں کہ میں
یہاں نواب پر جبیں قدر کی صاحبزادیوں کو تعلیم دیتی ہوں اگر آپ لوگ حضراتِ لکھنؤ
اتنی ہی مہمان نوازی پر وضعداری کے ساتھ قائم رہیں گے اور میرے انشراحِ جرأت
پر مُصر نہ ہوں گے، تو غالباً میں اپنی اس مضمحل زندگی پر نہایت مسرت کے ساتھ قانع
بھی رہوں گی، ہائے اطمینان و آرام سے مرجاتا، اب تو اک یہی آرزو اور باقی ہے"

دعا فرمائے کہ میں اس میں کامیاب ہوں،، اتنا کہہ کے حمیدہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور رومال سے پونچھ کے خاموش گردن جھکا کے بیٹھ گئی۔ اس کلام میں ایسا معمولی سوز و گداز نہ تھا جو **افضال** پر اثر نہ کرتا، وہ سُنکر چیخ مارنے کے لئے آمادہ ہو جاتا مگر اس نے غیر معمولی ضبط سے کام لیا اور اپنے دل میں ٹھان لیا کہ جس طرح ممکن ہو گا اس کے حالات سے واقفیت حاصل کروں گا اور جہاں تک ہو گا اس کی ہمدردی کروں گا، اب تقاضائے بشریت و شرافت نے اس کو حمیدہ کا ہمدم بنا دیا تھا، اور غالباً یہ وہ اجبار تھا جس کا مقابلہ کرنا **افضال** کی فطرت کے بالکل خلاف تھا۔ وہ اس کے جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ خادمہ نے ایک تار حمیدہ کو لا کر دیا۔ اس نے نہایت اضطراب کے ساتھ اُس کو چاک کیا اور پڑھتے ہی سامنے کھڑی کو دیکھا اور یکبارگی اُٹھ کھڑی ہوئی "میں معافی چاہتی ہوں، میری عزیز بہن زبیدہ مجھکو فوراً طلب کرتی ہیں اور اگر میں فوراً طیاری کر دوں گی، تو غالباً شام کی گاڑی مجھے مل جائے گی، اگر آپ جواب خطوط کی زحمت گوارا فرمانے کا وعدہ فرمائیں گے تو میں غالباً آپ کی خیریت دریافت کرنے کی کوشش کروں گی، ممکن ہے مجھے ایک ہفتہ سے زائد وہاں لگ جائے" حمیدہ کو ہر طرح سے اطمینان دلانے کے بعد کہ وہ اُس کے حال سے غافل نہیں ہو سکتا **افضال** چلا گیا۔

(۱۰)

سمجھ لیجئے کہ ۳ ماہ گذر گئے اور اب تک حمیدہ واپس نہیں آئی، اُس کے خطوط آتے ہیں اور ہر تحریر میں وہ اپنے آمد کی خبر دیتی ہے۔ بارش شروع ہو گئی

اور افضال گئے بیچ رخصت ہو چکنے کے بعد اب تک لکھنؤ ہی میں مقیم ہے۔ گو اس عرصہ میں مظفر صاحب کی کئی تحریریں آئیں لیکن افضال کچھ لکھنؤ سے ایسا مانوس ہو گیا تھا کہ اُن کو بلطائف الحیل سے ٹالتا رہا اور امروز فردا کرتے کرتے اُس کو ۳ ماہ سے زائد یہاں قیام کئے ہوئے ہو گیا۔ رقیہ جب چلنے پر اصرار کرتی تو وہ کہہ دیتا کہ یہاں یہاں کی دیکھی خزاں بہار کی گذاری اب ذرا برسات بھی یہاں کی دیکھ لو۔

پانی برس کر کھل گیا تھا اور شام کی تفریح کے لئے افضال طیار ہو چکا تھا اور رقیہ کپڑے پہن رہی تھی کہ زہرہ آئی اور افضال سے اُس نے کہا کہ "حضور جائیں بیگم صاحب کو کچھ حرارت ہو آئی ہے" یہ سُن کے وہ بھی اسی کے ساتھ اندر گیا اور رقیہ کو ایک کوچ پر پڑا ہوا پایا تپ نہایت تیز تھی اور وہ مشکل سے اپنے حواس کو کام میں لا سکتی تھی اُس کو حیرت تھی کہ ابھی ابھی حرارت کی خبر ملنا اور اُس کا فوراً اس درجہ تیز ہو جانا آخر یہ بات کیا ہے۔ وہ رقیہ سے نہ پوچھ سکتا تھا کیونکہ اُس پر غشی کی سی حالت طاری تھی اور وہ اپنے ہوش میں نہ تھی۔ فوراً لیڈی ڈاکٹر کے لئے اور حکیم صاحب کی طلبی کے لئے آدمی دوڑائے گئے اور ایک تار مظفر صاحب کو دیا گیا۔ افضال اس درجہ پریشان اور مضطرب تھا کہ نہ اُس سے رقیہ ہی کے پاس بیٹھا جاتا تھا اور نہ باہر رہ سکتا تھا ہر لمحہ رقیہ کے کرب و اضمحلال قویٰ میں ایک اضافہ نظر آتا تھا اور خدا معلوم وہ کن کن اوہام کا شکار بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر و حکیم آئے نبض دیکھی آلات سے سینہ و قلب کی حالت معلوم کی گئی، دوائیں شروع ہوئیں علاج بدلے گئے، غرضکہ افضال کے امکان میں جتنی تدابیر تھیں سب عمل میں لائی گئیں مگر اس حالت میں تین دن گذر گئے اور مطلق کوئی نفع نہ ہوا ابھی مظفر اور

شمس النسا بیگم بھی آ گئی تھیں، لیکن رقیہ کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ کون پاس بیٹھا ہے اور کون نہیں۔ چوتھے دن جب چاروں طرف سے یاس اور ناامیدی نے گھیر لیا، تو افضال ضبط نہ کر سکا اور بے اختیار رقیہ سے لپٹ کر رونے لگا، مگر آہ اُس کا دم شاید اسی آغوش کا منتظر تھا کہ سینہ ملتے ہی رقیہ کے نبض کی تپش آخری بھی معدوم تھی۔ آہ، اب افضال کو معلوم ہوا کہ اُسے رقیہ کے ساتھ کس قدر الفت تھی، اُس کے آنسو خشک ہو گئے تھے، آنکھیں پھٹ کر رہ گئی تھیں، گلا بیٹھ گیا تھا اور روح تھی کہ اندر ہی اندر نکل جانے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ اُس عروس نو کے پُر آرزو جنازہ کو تہ زمین پہونچے ہوئے، تین دن ہو گئے تھے اُس کے والدین بھی کچھ آشنائے سکون ہو چلے تھے، مگر افضال، آہ، اُسے غم نے بالکل دیوانہ کر دیا تھا اور اُسے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ یہ بھی سمجھتا کہ آخر اُس پر مصیبت کیا پڑی ہے۔ کوئی بات کرتا تھا تو اُس کی سمجھ میں نہ آتی تھی، کوئی سامنے سے گذر جاتا تھا تو اُسے نظر نہ پڑتا تھا، کھانا پینا بالکل ترک تھا غرضکہ اُس کے حواس خمسہ بالکل اُس کے قابو میں نہ تھے اور آخرکار نہایت بُری طرح وہ بھی بیمار ہو کر پڑ گیا ہولوی مظفر کے قلب میں ابھی اپنی بیٹی ہی کا داغ مفارقت ہرا تھا کہ افضال کی بیماری نے اور زیادہ اُس کو مجروح کر دیا۔

ایک ہفتہ تک افضال کی حالت نہایت مخدوش رہی، لیکن اُس کے بعد اُس کی طبیعت کچھ سنبھلی، وہ پھر مولوی مظفر افضال کے پاس بیٹھے ہوئے مختلف باتوں سے اُس کے جی بہلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ڈاک سے اخبار آیا، اُس کو کھول کے وہ زور سے پڑھنے لگے تاکہ افضال بھی سُنے۔ لوکل اخبار کے سلسلہ میں ایک واقعہ درج تھا جس کو بالتخصیص زیادہ زور کے ساتھ اُنھوں نے پڑھا۔

"شب گذشتہ ۹-۱۰ کے درمیان ایک خاتون اسٹیشن سے اٹین آباد ایک گاڑی میں جارہی تھی کہ قلعہ کے پاس پہنچ کے گاڑی رکی اور دو آدمیوں نے اندر گھس کر خنجر سے اس کا کام تمام کردیا اور بھاگ گئے۔ مال کچھ نہیں گیا۔ تفتیش جاری ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ شاہجہاں پور سے آرہی تھی اور حمیدہ نام تھا"

حمیدہ! بس یہ لفظ تو افضال کے منہ سے حواس میں نکلا، پھر اُس کو خبر نہیں کہ وہ کب تک بیہوش رہا اور کیونکر وہ صبح تک ہوش میں لایا گیا۔
کو مولوی مظفر اُسے بمبئی لے گئے، اور وہاں اُس کی تفریح کے لئے جملہ سامان مہیا کئے گئے، لیکن ہم کو یہی خدشہ رہا کہ دیکھئے اُس کی جانِ ناتواں پر اکبارگی ایسے شدید آلام کا کیا اثر پڑتا ہے۔ براہ راست ہمارے پاس مولوی صاحب کے بھی خطوط آتے اور افضال کی تحریریں بھی، جن میں نہایت اصرار کے ساتھ ہمیں بلایا جارہا تھا، لیکن افسوس ہے کہ ہمیں جانے میں دیر ہوگئی، اور جس دن وہاں پہنچے، تو معلوم ہوا کہ دو دن سے حضرت کا کہیں پتہ نہیں ہے خدا معلوم کہاں چل دئے ہیں۔

(۱۱)

بمبئی میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی، جہاں اُس کی جستجو نہ ہوئی ہو، قرب و جوار میں کوئی مقام ایسا نہ تھا، جہاں اُس کی تلاش میں آدمی نہ روانہ کئے گئے ہوں، مگر اُس کا کہیں پتہ نہ لگتا۔ پندرہ دن سے زائد اس واقعہ کو ہوگئے۔ اک شام کو میں اپالو بندر کے ساحل پر ٹہلتا ہوا، ذرا اور جنوب کی طرف بڑھ گیا۔ مگر میری حیرت و مسرت کی کچھ انتہا نہ تھی، جب میں نے اُس کو کنارے پر پیر لٹکائے ہوئے، بیدار مار کے پانی سے کھیلتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اُسے ۳۰-۴۰ قدم کے فاصلہ سے پہچان لیا تھا اور

بے اختیار چلا اُٹھنے اور دوڑ پڑنے کو جی چاہتا تھا لیکن گو آواز پر تو قابو پا گیا، مگر پیروں کی حرکت میرے اختیار میں نہ تھی، اُس کو دیکھتے ہی، ہوا دفعۃً اُس تک پہنچنے کا خیال پیدا ہوا، اور سرعت برق سے اُس کے پاس پہنچ گیا، مگر نہ اُس نے آہٹ قدم سُنی اور نہ پیچھے مڑ کے دیکھا۔ میں چاہتا تھا کہ اک غیر متوقع مسرت بنکر اُس کے پاس جاؤں، اور وہ مجھے دیکھ کے، اس قدر قریب اچانک دیکھ کے دفعتہً متحیر رہ جائے، لیکن میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ ۵ منٹ مجھے اسی حالت سے کھڑے ہوئے گذر گئے، مگر اُس کا کھیل ختم نہ ہوا، میں نے اُس کی آنکھیں اپنے ہاتھوں سے بند کر لیں اس خیال سے کہ وہ آنکھیں بند ہوتے ہی اک اضطراب کے ساتھ چونک پڑیگا، اور اُس کا خیال اُن موجوں سے ہٹ جائے گا، جن کی بیتابیوں سے وہ اس قدر انہماک کے ساتھ لاعب نظر آتا تھا۔ مگر آہ، میرے حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے اس پر بھی کچھ خیال نہ کیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں، مگر اُس کا ہاتھ برابر اُسی رفتار سے بید کو حرکت دے رہا تھا، اُس نے اک طویل قہقہہ سے مجھ کو یقین دلا دیا کہ شاید وہ پہچان گیا ہے اور اس لئے میں اُس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کے، بازو کو جھٹکا دیکے سامنے آ گیا، لیکن اُس کا اکبار دیکھ کے، نہایت متحیر و متبسم آنکھوں سے دیکھ کے، صرف اتنا کہنا کہ "آخاہ، آپ تشریف لے آئے" اور پھر اُسی طرح گردن پھیر کے اپنے شغل سابق میں مصروف ہو جانا، میرے لئے اک ایسا غیر معمولی طور سے متحیر کر دینے والا منظر تھا، جس کو میری آنکھوں نے مشکل سے یقین کیا۔ وہ برہنہ سر تھا، بال اُلجھے ہوئے اور گرد آلود تھے، کپڑے بہت میلے تھے چہرہ زرد تھا، غرضکہ نہایت تباہ و پریشان حالت تھی جو میری بینائی کو صدمہ پہنچا رہی تھی، (غیر معمولی آلام نے شاید

اُس کے حواس پر بہت بڑا اثر کیا تھا، اور اُس کے جذبات سخت مجروح و بے کار ہو گئے تھے، میں بھی سمجھ گیا، لیکن تحیر و شش و پنج میں اُس نے مجھ سے بالکل مخاطبہ نہ کیا اور تھوڑی دیر تک اسی طرح بید کو حرکت دیتے ہوئے اُس نے پانی پر آہستہ سے دے پھینکا اور دیر تک اُس کا تعاقب اپنے نگاہ سے کرتا رہا۔ میں نے کہا "افضال، کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا؟" اُس نے چونک کر جواب دیا "کیا فرمایا آپ نے؟ ہاں، میں نے آپ کو پہچانا بھی اور سمجھا بھی۔ یہ آپ کو کیونکر گمان گذرا کہ میں آپ کو بھول گیا ہوں، مگر کوشش کر رہا ہوں کہ سوائے اپنے سب کو بھول جاؤں، کیا آپ کو اس سے کچھ اختلاف ہے، مگر وہ تجربہ بتلاتا ہے کہ دنیا و مافیہا سے گذر جانے کے لئے پہلے خود فراموشی ضروری ہے، گو یہ امر نہایت تکلیف دہ ہے لیکن میں یہ بھی کروں گا خیر اس کا تذکرہ چھوڑیے آپ کب تشریف لائے، مزاج تو بخیر ہے؟" اس کے اس اندازِ گفتگو سے جتنا صدمہ مجھی مجھ کو پہنچا کم تھا، کیونکہ میری زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ **افضال** اس درجہ سرد مہری کے ساتھ مجھ سے پیش آیا ہو میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں، تمام جسم میں سنسناہٹ سی پیدا ہو گئی، اور اس کے جواب میں سوائے ان الفاظ کے میں اور کچھ نہ کہہ سکا کہ "افضال، یہ تم باتیں کیسی کر رہے ہو، تم دیکھتے ہو کہ تم سے کون گفتگو کر رہا ہے" ایک طویل قہقہہ کے ساتھ وہ ایک طرف کو جھکا اور اپنے بائیں ہاتھ پر زور دیکر ایکبارگی اُٹھ بیٹھا اور مجھ سے بولا "اچھا، آپ کو شکایت ہے کہ میں نے آپ کو پہچانا نہیں، لیکن کیا آپ کا یہ مقصد تھا کہ میں آپ کو دیکھتے ہی بیتاب ہو جاتا، اُٹھ کے آپ سے لپٹ جاتا، بیشک، کچھ اسی نوع کے جذبات میرے دل میں پیدا ہوئے تھے لیکن آپ کو شاید علم نہیں کہ میں اب

ان سے متنفر ہو چلا ہوں، ان سب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں (اس کی آواز تیز ہو جاتی تھی) آہ، آپ خوب جانتے ہیں مجھ سے زیادہ بیتاب، مجھ سے زیادہ سریع الحس، مجھ سے زیادہ مسرات میں منہمک ہو جانے والا کون ہو سکتا تھا (دریا کی طرف اشارہ کر کے) ان موجوں کے پیچ و خم پر چھا جانے کے اضطرار کو آپ دیکھ سکتے ہیں اور اس کا اندازہ کر سکتے ہیں، لیکن کیا آپ نے امواج مسرات میں میرے تلاطم قلب کے نسبت بھی کوئی صحیح قیاس قائم کرنے کی کوشش کی ہے؟ آہ، اس زیادہ یوں سمجھئے، مطمئن و ساکت رفتار سے اپنا فرض زندگی ادا کرنے والا مشوکرہ (جیانم ہوں کہہ سکتا ہے کہ وہ بےچین و مضطرب ہے، لیکن میں تو اس متحرک سطح رقیق کو دیکھتا ہوں جو اس کے اجزاء نور کو اپنی گرہوں میں لئے ہوئے اسے ایک ضیاء منتشر بنائے ہوئے، اسے کیا خبر تھی کہ اک بےچین کی صحبت و معیت بھی بےچین ہوتی ہے' آہ مجھ سے محبت رکھنے والے مجھ سے بھی زیادہ تڑپا کرتے تھے کیا اس سے زیادہ متعدی بیتابی آپ چاہتے تھے؟ مگر اب اس کو محو کرنا چاہتا ہوں، ایک اک ذرہ کی حرکت سے متاثر ہو کے دیکھ لیا، اک مرقع حسن و تخیل کو متاثر بنا کے دیکھ لیا، تڑپ کے دیکھ لیا، تڑپا کے دیکھ لیا۔ مگر وہ تپش جس کے سطح برق و سیم متجسس تھی، وہ بیتابی جس کے لئے میری ہستی کوشاں تھی صرف سکون میں ملی، لہریں حرکت کرتے کرتے ساحل ہوتی جاتی ہیں، مگر وہ خاموش ہے اجزا کر کے دیکھئے تو معلوم ہو کہ وہ فی الحقیقت اک اضطرار ہے خاموش، اک بےچینی ہے ملفوف، اک بیتابی ہے کشیدہ۔ اگر امواج کی حرکت اس کو زیادہ متاثر کرے تو اپنے میں ملا لے، ساحل سے جھوڑ کیا گلہ کیا؟ معاف کیجئے گا، لڑکپن کی خوشیاں رعنائی و شباب کے کمال میں تکمیل ہو جاتی ہیں مگر ہائے وہ برق خاموش جو

اس سکون حیا سے پیدا ہوتی ہے اُس کے سامنے وہ شوخیاں بالکل سست رفتار اور ساکن نظر آتی ہیں، اگر یہ نہیں تو کیا سبب ہے کہ نگاہ بے محابا چشمِ حیا پردہ کی طرح تپش آموز نہیں، کیا وجہ ہے کہ کھلا ہوا چہرہ، روے زیرِ نقاب سے زیادہ خلش افزا نہیں۔ ہاے لطف تو اس میں ہے کہ میں ہوش کی باتیں کروں، مگر سمجھنے والے دیوانہ ہی سمجھیں، حواس مجتمع ہوں مگر آپ یہی کہیں کہ نہیں منتشر ہیں۔ غضب خدا کا آپ نے میرے قہقہہ کو واقعی قہقہہ سمجھا! اس سے زیادہ میری گریہ وزاری کیا ہو سکتی ہے آہ، کیا کروں رونا بھول گیا ہوں، آنکھیں خشک پڑی ہیں کبھی قصد بھی کرتا ہوں تو اور ہنسنے لگتا ہوں، (کچھ چونک کر) خیر اب تو آپ یہاں موجود ہیں، غالباً مجھ کو معاف کرنے کے لئے بہت سے بہانے آپ کے ہاتھ آجاویں گے" (میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک طرف کو ہو لیا)۔

میں خاموش تھا، متحیر تھا، بالکل کھویا ہوا تھا، اُس کے اس فلسفۂ بیتابی کو سُن سُن کر ڈر رہا تھا اور یقین کر رہا تھا کہ اب اس کی دیوانگی علاج سے گذر گئی ہے۔ میں اُس کے ساتھ گھسٹتا ہوا چلا جا رہا تھا، لیکن کچھ پتہ نہ تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور کس طرف اُس کا قصد ہے مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں اُس سے پوچھتا، یا اپنے ارادہ کے موافق اُسے **مظفر منزل** لے جاتا۔ سطحِ سمندر میں نصف آفتاب غرق ہو چکا تھا اور نصف حصہ کی ارغوانی شعاعیں موجوں کے ساتھ ملی ہوئی تیر رہی تھیں اور رفتہ رفتہ گم تھیں میں غائب ہو رہی تھیں، ایک اور صرف خطِ زریں اس وسیع کرۂ آب کا عرض البلد بننے کے لئے باقی رہ گیا تھا کہ ہمارے پہلو میں اک گاڑی رُکی اور اک صداے سیمیں نے **افضال** کی جھکی ہوئی گردن اوپر اُٹھا دی۔ پارسی لباس میں

اک پارسی نژاد نازنین کے نازک ہاتھ میں **افضال** کا ہاتھ تھا، نہایت تیز اور شیریں لہجہ میں اُس سے دو دن تک نہ ملنے کی شکایت ہو رہی تھی، اور اس کی معمولی معذرت خواہی کے جواب میں ساتھ چلنے کا اصرار ہو رہا تھا، گو **افضال** نے مجھ کو بطور بہانہ کے پیش کیا اور بہت پیچھا چھڑانے کی کوشش کی، لیکن یہ کس قدر سخت بات تھی کہ اب اس سے زیادہ مجھے اصرار کیا جا رہا تھا اور جب میں یہ خیال کرتا کہ یہ مخاطبہ اور صدق فی الحقیقت مجھ سے بالکل غیر متعلق ہے تو پریشانی اور بڑھ جاتی تھی، ممکن تھا کہ کچھ سوچ سمجھ کے، حواس جمع کر کے میں بھی اس حسین بلا کے ٹالنے کی کوشش کرتا، مگر بلا انتظار جواب اُس نے ہاتھ پکڑ کے مجھے اور افضال دونوں کو گاڑی پر بٹھا لیا اور چل دی، اس وقت یہ تخیل بھی عجیب تھا کہ اک عورت مرد کو بھگائے لئے جا رہی ہے۔

واسٹے کا راستہ شکوہ شکایت ہی میں کٹ گیا، مگر انگریزی زبان چونکہ جذبات محبت کے اظہار کے لئے کچھ نزاکت سے بعید معلوم ہوتی ہے، اس لئے فی الحقیقت مجھے تو کوئی خاص لطف اس شکایتِ عریاں میں آیا نہیں، لیکن اگر کوئی دلچسپی کی بات تھی تو اُس کی رعنائی حسن تھی اور حیرت انگیز امر تھا تو یہ تھا کہ باوصف اُس کے اس قدر پیچھے جانے کے بھی **افضال** کی آنکھ فرش سے اوپر اٹھتی تھی۔ وہ کون تھی؟ افضال سے اُس کی ملاقات کیونکر ہوئی، یہ بلا کی اور بے تکلفی کیسی، اور وہ لئے کہاں جا رہی تھی اور کیوں؟ ان سب باتوں پر غور کرنے کا موقعہ اُس وقت ملا جب گاڑی اک بنگلہ پر آکر ٹھہری اور ہم لوگ اُتر کے باہر برآمدہ میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میری معرفی اس سے قبل ہی ہو چکی تھی اور اب وہ ساعت تھی جب اُس کی معرفی مجھ سے ان الفاظ میں کی جا رہی تھی "آپ ہی وہ مس گوہر ہیں جو اس وقت دنیا سے بیچ

ہیں اس قدر شہرت وقبولیت حاصل کرچکی ہیں" اک حد تک اس منظرِ مبہم پر روشنی ڈالی گئی، مگر افضال، ایسے پریشان حال، ایسے شکستہ وحتجم شخص سے آخر محبت وخود داری کی ملاقات کیسی ؟ افسوس ہے کہ یہ معمّہ اخیر تک حل نہ ہوا، مگر اس میں کلام نہیں کہ وہ افضال کو غیر معمولی عزت ومحبت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور ادب بھی بہت کرتی تھی، میں اوّل اوّل تو بہت مسرور ہوا تھا کہ شاید بہ صورت اس کے دل مغموم کا علاج ہوجائے گی، مگر اس ایک گھنٹہ کے تجربہ نے بتلا دیا کہ وہ اس کی دیوانہ وضعی ہی پر مرتی تھی، اور افضال کی حالت تو یہ تھی کہ اس سے اظہارِ محبت کرنا گویا اس کے دل ودماغ سے دشمنی کرنا تھی، اس کے اندازِ گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ افضال سے بالکل بے تکلف ہونا چاہتی ہے لیکن اس نے اپنے طرزِ عمل سے اس وقت تک گوہر کی محبت کو صرف اک سلسلۂ آرزو بنا رکھا تھا، گو وہ یہ سمجھتی تھی کہ افضال کی بے حسی جمودِ طبیعت کی بنا پر نہ تھی، لیکن اسی کے ساتھ جب حقیقی اسباب کو وہ اس وجہ ظلمت وتاریکی میں پاتی تھی تو فطرتاً، جیسا کہ حسن کا خاصہ ہے، حصولِ مقصود کے لئے وہ غیر معمولی جسارت وبیباکی پر آمادہ ہوجاتی تھی، اس کے دل ودماغ میں رہ رہ کر اٹھتے، اس کی ہستی میں تمنا بنکر رہنے کے لئے کافی سے زیادہ اسباب افضال کے وجود میں تھے، لیکن وہ صرف اتنا ہی نہ چاہتی تھی کہ یہ شغف اسی حد تک رہ جائے، وہ پرستش خاموش سے ذرا گھبراتی تھی اور اس کی تمنا یہ تھی کہ وہ اپنی گرویدگی کو افضال کی آنکھوں میں بھی منعکس دیکھے، اگر اس کی نگاہیں حسن پرست نہیں، تو وہ افضال کے نظارہ کو بھی اپنے طرف مائل دیکھنا چاہتی تھی دورانِ گفتگو میں اس نے فلسفۂ محبت پر کچھ بحث شروع کی، اور بے تکلفی سے بھی دیتی تھی،

سننے کے بعد اکبارگی اقضال چونک پڑا اور جھنجھلا کر بولا "محبت! محبت اک جذباتِ فانی کا انعکاس، داعیاتِ شباب کا اک فوری جوش، سیلابِ خواہشات کا اک موقت مد، آپ سمجھتی ہین کہ آپ اوسے اپنے سینہ مین محسوس کرتی ہین۔ بیشک میرا ایمان ہے کہ جنسِ لطیف کا سینہ ان لطیف نازک حسیات کا محل بننے کے لیے نہایت موزون ہے، مگر جسوقت آپ کے شباب کو اون سے جدا دیکھتا ہون تو پرانی عمارت کے نقش و نگار سے زیادہ اونکو نمایان نہین پاتا، دل مین میٹھا میٹھا درد، لبون پر چند بے اختیار ابھی ابھی سانسین، یہ تمنا ریز آنکھون کا انداز (وہ اب بالکل محجوب نگاہین نیچے کیے بیٹھی تھی اور اقضال کا جوش بڑھتا ہوا نظر آتا تھا) انگڑائیان لینے کی خواہش اعضا مین محسوس کرنا، مین خوب سمجھتا ہون کہ صرف ذراسی خواہش درکار ہے آپ منتظر ہین کہ کوئی آغوش کھلی ہوئی ملے اور اپنے تئین آپ سپرد کردین، معاف کیجیے گا روئے سخن آپ کے طرف نہین، مین اک عام بات کہہ رہا ہون، مگر مجھے اسکا یقین نہین کہ آپ کا مشام کسی کے بدن سے اک عرصۂ دراز تک نکہت گیر بنا رہیگا، جسوقت یہ دل کسی کے پہلو مین آکر چند دن رہ رہا، جب آپکی ٹھنڈی سانسون کا جواب اون سے زیادہ طویل آہون سے دیدیا گیا، جسوقت آپ کی نگاہون سے ٹپکنے والی تمنائین سینہ سے لگالی گئین، جب آپ کی انگڑائیان فشارِ آغوش سے دبا دی گئین، کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کی تسلیات اندمالِ جراحت کے لیے نہ تھین بلکہ اوس سے مقصود اور انشراحِ زخم تھا۔ آہ! اوس زمانہ کی یاد اب بھی کبھی کبھی میرے بدن مین جنبش پیدا کردیتی ہے، جب مین کسی سے آنکھ ملا کے گفتگو کرنے کی جرات بھی اپنے مین نہین پاتا تھا، اب تو ماشاءاللہ

اون منتخب خاتونون مین سے ہین جنکا نام ہی ساری حسیات کے بیدار کرنے کے
لیے کافی ہے، چہ جائیکہ یون بے محابا اور بیباکانہ جلوہ پاشی نگاہ سے ارتعاش ہستی
کا درس حاصل کر لینا، مگر آپ یہ سنکر تعجب کرینگی کہ وہ شخص جو تخیل خوش چشمی مین برگ
نیلوفر کو دیکھ کر گھنٹون اوسکی پرستش کیا کرتا تھا، اب اوس کے سامنے خود نگاہین
پکار پکار کے نیوا، پر محبت آنکھون کا تعویذ عشق پیش کرتی ہین، اور وہ ہے کہ ذرا
حرکت بھی اپنے قلب مین محسوس نہین کرتا۔ آپ سمجھین؟ یہ کیون ہے؟ آہ، وہ
سمجھتا تھا کہ حسن و محبت ایک چیز ہے، وہ جانتا تھا کہ یہ نگاہین بار الفت سے
دبی ہوتی ہین، ورنہ جھکی ہوئی کیون ہون؟ وہ یاد کرتا تھا کہ اک لطیف
سینہ کی تمنائین، محبت کی مختلف صورتین ہین صرف جنکے نام جدا جدا ہین ورنہ
فی الحقیقت وہ ایک ہی چیز ہے، وہ یقین کرتا تھا کہ عورت نام ہے عشق کا
اور اوسکی ادائین اوس عشق کا نطق ہے، مگر اوسکا یہ خیال غلط ثابت ہوا، عشق
و خود غرضی کا اجتماع ممکن ہے، مگر حسن و محبت کا ناممکن ہے، وہ زمانہ جب تخیل شباب
ہر ہر ذرہ مین اک دنیائے آغوش دکھا دیتا ہے سخت قابل نفرت و استکراہ
ہے، اور الحمد للہ، مین ان فریب کاریون سے آگاہ ہو گیا ہون، معاف کیجیے
وہ شاخ جو خشک ہو چکی ہے، پھر برگ و بار نہین لا سکتی، صدف ایک بار منہ
کھولکر قطرۂ نیسان لے لیتی ہے اب یہ اوسکی قسمت ہے کہ وہ گوہر ہو جائے
یا پانی خام ہے، اوس کے ٹکڑے کر دیتے ہین، پھر کہین پتہ چلتا ہے کہ
موتی تھا یا نہین۔ خیر، بہرحال مین آپکی اس محبت و دلنوازی کا منت
کش ہون، اس سے زیادہ مجھ پر نازل ہونے کی ضرورت [illegible]

باتون سے مرجائے، اوس کے لئے کھاتون کی کیا ضرورت ہے؟" یہ کہکے وہ اُٹھا اور جلدی جلدی قدم رکھتا ہوا احاطہ سے باہر نکل گیا، مین اسدرجہ متاثر اور متحیر تھا کہ جب وہ اتنی دور نکل گیا ہے جب مجھے خبر ہوئی - یہ دیکھ کے مجھے سخت صدمہ ہوا کہ جب افضال چلا گیا، تو بے اختیار گوہر کی آنکھون سے آنسو نکل پڑے، مگر اوس نے کوئی کوشش اوس کے دوبارہ بلانے کی نہین کی، معلوم ہوتا تھا کہ اس نوع کے منظر سے وہ پہلے بھی کئی دفعہ متاثر ہو چکی ہے -

(۱۲)

ایک ماہ سے زاید ہو چکا ہے، افضال اب مظفر منزل مین مقیم ہے، اور ہر صبح اوسکے جوش جنون مین اضافہ ہوتی جاتی ہے، میری موجودگی کی صرف اسقدر رعایت اوس کے جنونکدہ وارفتگی مین ملحوظ تھی، کہ اب وہ محض میرے خیال سے اول تو کہین جاتا نہ تھا اور اگر جاتا بھی تھا، تو میرے ساتھ ہی واپس آجاتا تھا۔ وہ کہان جاتا تھا اور کیون؟ آہ، یہی بات تھی جو مجھے خائف رکھتی تھی بیٹھے بیٹھے وہ اوٹھہ کھڑا ہوتا، کمرہ مین دو چار چکر لگاکے گھبرا اوٹھتا، اور جھنجھلاکر باہر نکل جاتا، اوّل اوّل تو مینے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جب وہ جانے کا ارادہ کرتا تو فوراً گاڑی طیار کرالیتا اور وہ کہنے سننے سے بیٹھ بھی جاتا، مگر اب وہ بالکل نہ سنتا، اسلئے مجبوراً جب اس نوع کا جوش اضطراب اوسمین پاتا تو ساتھ ساتھ ہولیتا اور کسی نہ کسی طرح اوسکو پھر گھر واپس لے آتا وہ آبادی سے بہت گھبرانے لگا تھا اور اسی لئے زیادہ تر ساحلون پر اوسکا

وقت صرف ہوا کرتا تھا، وہ باتین کرتا، باتون کا جواب دیتا مگر ایسے دلگیرو
خشک لہجہ مین جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اوسکو سخت تکلیف ہوتی ہے - مین
بہت گھبرا گیا تھا اور اسدرمیان مین کئی بار وطن واپس جانے کا ارادہ بھی
کرچکا تھا، لیکن جب اس قسم کی گفتگو مین کرنا چاہتا، تو وہ فوراً سمجھ جاتا اور
گو زبان سے کچھ نہ کہتا، لیکن اوسکی وحشت اسدرجہ بڑھ جاتی جس سے مجبوراً
مجھکو ارادہ فسخ کرنا پڑتا۔ مس گوہر بلاناغہ روز آتی اور اس مین شک نہین
کہ جب تک وہ بیٹھی رہتی، افضال کے چہرہ پر اک سکون نظر آتا، لیکن
مشکل یہ تھی کہ وہ کسی کا کہنا نہ مانتا یہانتک کہ دوا بھی بدقت تمام پیتا تھا۔
ایک دن شام کو پائین باغ مین ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے افضال کی طبیعت
بہ نسبت اور دونون کے ذرا خوش تھی کہ مس گوہر بھی آگئین اور اوسکو
ذرا شگفتہ دیکھکر موسیقی پر کچھ بحث کرنے لگین، اور وہ نہایت سنجیدگی اور متانت
سے اوس کے سوالات کا جواب دے رہا تھا کہ دفعتہً اوس نے انداز تکلم
بدل کے انگریزی مین گفتگو شروع کر دی، وہ میرے نسبت سمجھی تھی کہ انگریزی سے
ناواقف ہے، اور نہ مین نے اوسکو آگاہ کیا تھا کہ تھوڑی بہت مین بھی جانتا ہون
دوران گفتگو مین اوس نے خاص اپنی زندگی پر روشنی ڈالنا شروع کی، اور
تمام جذبات و تخیلات کا بیان شروع کر دیا، جو اوس نے اپنی شادی کے متعلق
قائم کئے تھے۔ افضال اسوقت اسدرجہ آدمی بنا ہوا تھا کہ وہ نہایت دلچسپی
سے اوسکی گفتگو کو سن رہا تھا اور کبھی کبھی میرے طرف دیکھکر مسکرا پڑتا، جسکے معنے
یہ تھے کہ وہ اس وقت اس تخیل سے بہت خوش ہے کہ گوہر کو میری انگریزی

داعی کا مطلق علم نہین ہے - بہرحال اوس نے اپنی طویل تمہید کو جلد لپیٹنے کا
موقعہ ڈھونڈھ ہی نکالا اور آخر مین کھلم کھلا اظہار محبت کرتے ہوئے، یہ آرزو
ظاہر کر ہی دی کہ وہ **افضال** سے مناکحت چاہتی ہے - یہ سن کے مجھ مین تاب
نہ رہی اور فوراً انگریزی مین اس مضمون کا فقرہ میرے منہ سے نکل گیا کہ
"مین بھی آپ کی سفارش کرتا ہون" مین ابھی پوری طرح اوس کی پھٹی ہوئی آنکھون
کھلے ہوئے منہ، اُڑے ہوئے رنگ کا لطف نہ اوٹھا چکا تھا کہ ناگہان اک
برقعہ پوش عورت **افضال** کے سامنے تھی، اور شکل سے اوس نے اپنے
چہرہ کا نقاب ہٹایا ہوگا کہ اک چیخ کے ساتھ **افضال** کرسی سے گر کر بیہوش تھا -

(۱۳)

رات کے دس بج چکے تھے، اور جملہ تدابیر اوسکے ہوش مین لانے کی
عمل مین آ چکی تھین، لیکن وہ اک تصویر خاموش تھا، جو صرف دوسرون کے
جنبش دینے سے متحرک ہوسکتا تھا، آنکھین بند تھین مگر چہرہ مطمئن و مسرور
تھا، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ اس عالم بیہوشی مین بھی، کسی دریا کو دیکھ
دیکھکر خوش ہو رہا ہے۔ **مظفر منزل** کا وہ حصہ جو **افضال** کے قیام کے
لئے مخصوص تھا، ذرا جدا واقع تھا، اور اسلئے تاوقتیکہ قصداً کسی کو نہ بھیج کے
اطلاع نہ دیجاتی، یہ حال وہان کسی کو معلوم نہ ہوسکتا تھا، مین نے وہان
خبر نہین کی، کیون ؟، آہ، عجیب اضطراب و خلفشار کی صورت تھی۔ وہی برقعہ
پوش وجود جس نے **افضال** کے حواس چھین لئے تھے وہان موجود تھا،
اور یہ ممکن نہ تھا کہ یہ علامت بیہوشی کسی اور کے سامنے پیش کیجا سکتی، نہایت خفیہ

دوڑ دھوپ ہو رہی تھی، مگر یہ یادگار ہوشی عمران ہوش مین آنے سے
بالکل منکر نظر آتا تھا، اور زیادہ فکر یہ تھی کہ اگر ہوش مین آبھی گیا تو پھر اس
جلوہ طراز کو موجود دیکھ کر کہین اب کے وداع جان پر نہ آمادہ ہو جائے، غرضکہ
اک ناقابل حل عقدہ تھا، جو انتہا درجہ کی سراسیمگی پیدا کئے ہوئے تھا، مین کہین اوسے
چھوڑ کر جا نہ سکتا تھا، وہ خاتون جو قصداً یہین آئی تھی اور اس شہر مین بالکل اجنبی
تھی دوسری جگہ منتقل نہ کیجا سکتی تھی، اور افضالؔ کی طول غشی نے ایسی ضد اختیار
کی تھی کہ کسی طرح سننے ہی مین نہ آتی تھی، میرا خیال تھا کہ جس نے ہوشربائی کی
ہے، شاید وہی ہوش بخش اور تسلی دہ بھی ثابت ہوگا، لیکن، آہ اوس نے سچ
کہا تھا کہ وہ ان تاثرات سے اک حد تک گذر گیا تھا، یا یون سمجھئے۔ کہ فرط تاثر،
اور ابتدا سے تالم نے، اوسے ایسی معمولی چارہ سازیون سے مستغنی بنا دیا تھا،
دست حنائی کی خوشبو اوس نے سونگھی، نافہائے حلقہ زلف کی نکہت جدا
مشام نواز ہوئی، اگر سنتے کے دامن نے اپنی حرکت الگ اوس مین منتقل کرنا چاہی
مگر آہ، یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس عالم مین پہونچنے کا منتظر ہی تھا، اور اب کوئی
التجا اوسے وہان سے واپس نہ لاسکتی تھی۔

بارہ بج رہے تھے، افضالؔ کوچ پر تھا، مین پاس ہی کرسی پر، اور وہ خاتون
بالین پر، کہ اوس کے اعضا مین کچھ حرکت سی پیدا ہوئی، وہ اوٹھنا ہی چاہتی تھی
کہ دفعتاً اوس نے آنکھین کھولدین اور گھبرا کے اک جست کے ساتھ اوٹھ کھڑا ہوا،
اوسکا ہاتھ پکڑ کے اوٹھا لیا اور نہایت وحشتناک انداز سے چیخ اوٹھا "حمیدہ،
حمیدہ، کیا فی الحقیقت تم ہو، یا کیا دھوکا فریب، دغا اس صورت مین بھی نمایان

ہو سکتے ہین؟ (ہاتھ کو اک جھٹکے کے ساتھ الگ کر کے) ہٹو، چلو، میرے تکالیف و
آلام کا سر رشتہ تمھارے ہی ہاتھ مین ہے، تو اک تمہید جنون ہے، تیری
گلکاریان، تیری رنگ آمیزیان، جو تیرے نقش کو چھپائے ہوئے ہین، اب بالکل افسردہ
و بیرنگ ہین۔ تیری آنکھین جنکو مین ادب آموز دل سمجھتا تھا، ساحر ہین۔ مین نے جب
اونکو دیکھا تو اونھون نے مجھے مسحور کر دیا، ورنہ کیون تبادلۂ نگاہ کے ساتھ ہی اونمین
غرق ہو جانے کی خواہش مجھ مین پیدا ہوئی، آہ ڈوبنے والے کی لاش پانی پر تیرنے لگتی
ہے، لیکن اونھون نے اپنی مزارہائے آبی کے عمق مین مجھے ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا
مین محبت کرتا تھا، یعنی تڑپتا تھا، لوٹتا تھا. فریاد کرتا تھا، کراہتا تھا، اونکا شکار پھر کیا
تھا، خون مین غلطان تھا، لیکن اوسکا کرب و اضطرار، اوسکا انداز پرفشانی صرف اون
آنکھون مین تبسم بنکر رہنے کے لئے تھا، تمام قطرات خون، جنکی چھوٹی چھوٹی بوندین محبت
مجروح کی افسانہ رنگین تھین، کیا وہ اس قابل بھی نہ تھے کہ اک قطرۂ اشک اونکی قیمت
ٹھہرتا۔ میری جگرکاوی کی اس لئے وقعت کیجاتی تھی کہ اوسکے انعکاس سے آنکھین میگون
ہو جاتی تھین، میرا ریش دل اس لئے پسندیدہ تھا کہ آپ کے آنکھون کے ڈورے
ذرا گہرے رہتے اور اس لئے عدم چارہ گری کا بہانہ موجود تھا، مگر مین نے ہی کب حاجت
رفو ظاہر کی تھی، آپ کی پرسش نگاہ اس میرے استغنا سے برہم تھی، آپ کی جفا سرشت
آنکھین اس سے متاثر تھی، اوسکا عوض لینے آپ مجھ سے آئی ہین؟ لوگ مٹ مٹ کے
ابھرتے ہین کہ مجھے مٹائین، ادھر کے زندہ ہوتے ہین کہ مجھے فنا کر دین، غضب خدا
کا، میری زندگی اونکو بری معلوم ہوتی ہے۔ اچھا، یہ لیجئے مین اس کا جھگڑا ہی مٹا
دیتا ہون، یہ کہکے افضال رونے لگا، کپڑے نوچ کے پھینک دئے، اور ناخنو

سے اپنے چہرہ اور بدن کو مجروح کرنے لگا ۔ ادھر سے ادھر بیتابانہ دوڑ رہا تھا
اور کسی طرح قابو مین نہ آتا تھا ۔ حمیدہ ، جسکی آنکھین روتے روتے ورم کر آئی تھین ،
بالکل بے قابو ہو کر کمرہ کے پہلو والی کوٹھری مین چلی گئی تھی ، جہان اوسکا پلنگ بچھا ہوا
تھا ، اور مین اوس کے اس طرح ہٹ جانے سے ذرا خوش ہوا کہ کم از کم اوسکی بے چینی دیکھنے
پر تو مین مجبور نہ تھا ۔ مگر آہ ، حقیقی مصائب کا سامنا ابھی نہ ہوا تھا ۔

( ۱۴ )

اس جنون خلاصہ شب کی صبح آئی ، لیکن وہ دردانگیز اور جگر شگاف منظر ے کر آئی
جسکے بیان سے مین گھبرا رہا ہون ، (مین کوشش کرونگا کہ اس ناگوار جزو کتاب سے
گذر کر جلد اختتام پر پہونچ جاؤن )

مین نے افضال کو اوٹھایا ، اور بالکل خلاف توقع وہ پُرسکون حالت
مین اوٹھا ، دن زیادہ چڑھ آیا تھا ، اس نے سب سے پہلے میرا خیال حمیدہ کے
طرف منتقل ہوا لیکن اوسکے کمرہ کا دروازہ بند تھا ، اس لئے کوئی صورت نہ تھی کہ
مین بلا اجازت اندر چلا جاتا ، نہایت آہستگی سے دروازہ کھٹکھٹایا اور کھانسا
بھی لیکن کوئی جواب نہ ملا ، مین نے خیال کیا کہ وہ سوتی ہوگی اس لئے زور سے
آواز دی اور پیروں سے تھوڑا سا دروازہ کھول کے ، اندر نگاہ ڈالی ، تو اوسکو
چادر اوڑھے ہوے خاموش پایا ، مین لوٹ آتا ، اگر داہنے جانب مجھکو زمین
پر ایک رنگین شے نظر نہ آتی ، مین اک اضطراری حالت سے اندر گھس گیا اور وہ
چیز جس نے مجھ کو کلیجہ پکڑ کے بیٹھنے پر مجبور کر دیا ، وہ خون کے لختے تھے ، جو نہ
صرف زمین پر بلکہ چادر کے اوپر بھی نظر آتے تھے ، کیا حمیدہ نے خودکشی کر لی ؟

کیا اوسکو کسی نے مار ڈالا، کہین اقبال نے تو کوئی حرکت ایسی نہین کی؟ غرضکہ
آنِ واحد مین خدا معلوم کن کن خیالات نے دماغ کو گھیر لیا اور مجھے مبہوت و
مرتعش کر دیا مین ٹھیک نہین کہہ سکتا کہ کتنی دیر تک اسی حالت مین کھڑا رہا،
مگر ہان دس منٹ ضرور گذر گئے ہونگے، جب مجھکو کچھ ہوش آیا، اور چادر اوٹھاکر
اوسکی حالت معلوم کرنے کے لئے بیقرار ہوا۔

چہرہ سفید پڑ گیا تھا، رخسار بیٹھ گئے تھے، اور اسقدر گوشت گھل گیا تھا کہ
کانون کے آویزے ڈھیلے ہو کر چادر پر گر پڑے تھے، چوڑیان کہنیون تک چڑھ
گئی تھین اور کرتے کا گلا گردن سے جدا ہو کر کھل گیا تھا، آنکھین بند تھین، اور آنسو
کنارون سے جاری تھے، خفیف سا رعشہ ہاتھہ پیرون مین محسوس ہوتا تھا، نبضین سست
تھین، اور قلب انقطاع حرکت پر آمادہ۔ سینہ پر ہاتھہ رکھنے سے اوس نے
آنکھین کھولدین، لیکن وہ اک دنیائے یاس و نومیدی تھین، جنھون نے ملتے ہی
مجھے اپنے عالم مین کھینچ لیا، مژگان، جو اب اور بھی لانبی نظر آتی تھین، اسدرجہ ناتوانی
سے اوٹھتی تھین کہ مین نیچے اوپر کی پلکون کے وقفۂ انفصال کو اچھی طرح دیکھہ سکتا تھا،
ہونٹ خشک تھے، اور معلوم ہوتا تھا کہ انکی تر و تازگی بھی چشمہائے پرنم کی نگاہِ واپسین
سے رخصت ہونے کے لئے، وہین چلی گئی تھی۔ اوس نے مجھے دیکھکر نہایت ناتوان و
کمزور لہجہ مین پوچھا، وہ کہان ہین؟، مین اوسکا مطلب سمجھ گیا تھا لیکن اس پس و پیش مین
تھا کہ کہین وہ حضرت یہان آ کے، اور کوئی تازہ آفت نہ لائین، مگر اسوقت مجھے
اقبال کے صدمات کا مطلق خیال نہ تھا اور یہ میرے لئے محال تھا کہ اوسکی تعمیل حکم
نہ کرتا۔ مین گیا، اور فوراً اوسکو لے آیا، یہ بھی بالکل اتفاق تھا کہ وہ اسوقت ہوش مین تھا

اور میرے اشارہ ہی پر چلا آیا، مگر وہ منظر یاس کبھی عجیب تھا جب حمیدہ نے
اوسکو دیکھکر اوٹھنے کی خواہش کی، اور مشکل سے ایک بالشت تکیہ سے سر جدا ہوا ہوگا
کہ پھر بے قابو ہو کر، آہ کر کے، گر پڑی۔ افضال کے چہرہ پر ہوائیان چھوٹ رہی تھین،
اور وہ اس نظارۂ جنون فراموش سے بے انتہا متاثر ہو رہا تھا، وہ پاس ہی ایک
کرسی پر بیٹھ گیا، اور لگا بدحواس ہو کے مجھ سے سوالات کرنے "کیون، کیا حال ہے، خیریت
تو ہے؟ یہ بات کیا ہے؟" حمیدہ نے قطع کلام کر کے نہایت آہستگی سے جواب دیا،
"آپ مجھ سے سوال کرین، اور اگر موقعہ ہو، مزاج برہم نہ ہو تو جواب بھی سن لین، گو
اسوقت اس لحاظ سے کہ آپ کو دلبری کی غرض نہین، اور مجھکو عرض حال کی قوت
نہین، دونون برابر ہین، لیکن مین اپنا فرض سمجھتی ہون کہ تا دم واپسین آپ کو اس امر
سے باور کرانے کی کوشش کرون کہ مین فی الحقیقت اس درجہ عتاب و تعزیر کے قابل
نہ تھی،" افضال نے جواب دیا "مین دیکھتا ہون کہ آپ کی طبیعت غیر معمولی طور
سے مضمحل ہے، مناسب تو یہ تھا کہ آپ مختصر الفاظ مین بتلا دیتین کہ نصیب اعدا آپکو
زیادہ علالت تو نہین، گو مین اپنے لئے تو علاج پسند نہین کرتا، لیکن آپ کے
لئے خدارا مین اپنا کلیجہ روا نہ رکھونگا،" حمیدہ بولی "مین اس ہدایت کی ممنون
ہوئی، اور واقعی مین سمجھ گئی کہ جب آپکو میری صورت دیکھکر اسدرجہ تنفر پیدا ہوا
تھا، تو طوالت گفتگو کیونکر گوارا ہوگی، بہرحال مین معافی چاہتی ہون، اور اس امر
کا شکریہ ادا کرتی ہون کہ آپ کو بیماری کا خیال تو ہوا، لیکن علاج کی کوشش فرمانا
بہت بیجا ہے، علاج آپ ہو جائیگا اور شاید زیادہ زحمت گفتگو آپ کو نہ اوٹھانا
پڑیگی، کوئی آرزو اگر آپ کے دربار مین ہے تو صرف یہ کہ مین خود اپنے کانون سے

لفظ معافی آپ کی زبان سے سُن لوں کیا آپ اسقدر نہایت کرتے ہیں؟" اقبال
کا چہرہ تمتما اوٹھا غصہ سے نہیں بجائے حیوں آمیز تھا وہ اب اوس کے سمجھا گناہی
چاہتا تھا کہ میں نے ذرا کرخت لہجہ میں اوس سے کہا نہایت شرم کی بات ہے تمکو مطلق
خیال نہیں کہ اونکی کیا حالت ہو رہی ہے لا حول ولا قوۃ یہ بھی کوئی وحشت ہے بالکل
آدمیت ہی سے گذرے جاتے ہو" وہ یہ سنکر رُک گیا اور نہایت گھبرا کے کہنے لگا "معافی!
معافی کیسی" حمیدہ بولی "اوس قصور کی معافی جس نے مجھکو آپکے پندار و یقین میں
جفا شعار خود غرض دغا باز بنا رکھا ہے" اب اقبال خاموش تھا اور سر جھکا کے
خدا جانے کن خیالات میں مستغرق تھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نہ کہہ سکتا تھا کئی منٹ تک
وہ اسی حالت میں رہا میں دیکھ رہا تھا کہ حمیدہ کی طبیعت اب زیادہ بگڑ رہی تھی اور
وہ مشکل سے اپنی رکا ہوئے کا ضبط کر سکی تھی پھر اوس نے کہا "کیا بالکل نا امید
ہو جاوں؟" اقبال چونکا اور نہایت محجوب ہو کر بولا "اگر آپ کی خوشی اسی میں
ہے تو میں معاف کرتا ہوں لیکن یہ ملحوظ رہے کہ جو الفاظ آپ کے منہ سے نکلا چاہتے
تھے وہ مجھ سے کہلائے جاتے ہیں" میں نے دیکھا کہ اب حمیدہ کا چہرہ بہت مسرور
نظر آتا تھا اور وہ اس کے جواب میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ "ہائے اوس
زود پشیماں کا پشیماں ہونا" لیکن اوس کی آواز بہت
پست ہو گئی اور آنکھیں بند ہو گئیں میں تو صرف اپنے آنسو کو ضبط کر رہا تھا
لیکن ہمارے میاں اب کسی طرح نہ دیکھ سکتا تھا آخر کار باہر نکل آیا اور خوب پھوٹ پھوٹ
کر رونے لگا میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے باہر دس منٹ سے زیادہ کسی طرح صرف ہو گئے
اور اس کے بعد جب اندر گیا تو حمیدہ مر چکی تھی اور اوسکی نعش ہر دو کی آغوش میں

افضال پڑا تھا لیکن بیہوش۔

(۱۵)

اسواقعہ کے دو ماہ بعد کی بھی یہی خبر تھی کہ افضال اک مقفل مکان مین،
جسکے دروازے آہنی سلاخون سے مستحکم کردے گئے ہین، محبوس ہے، لوگون نے
ادسطرف سے نکلنا بھی بند کر دیا ہے اور مولوی مظفر صاحب نے ان مسلسل
صدمات کے وجہ سے بلکل ہی سے ترک سکونت کر دی ہے، اور محض افضال کید
سے اوتھون نے اک ایسے مختصر مقام مین سکونت اختیار کی ہے جو ڈاکٹرون کی رائے
کے مطابق اوس کے دماغ کے لئے مناسب و موزون ہے علاج ہو رہا ہے
لیکن اوسکا جنون حد سے گذرتا جاتا ہے، خدا کرے وہ تندرست ہو جائے، لکن
کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ

ہمین یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اوسکے سریع الحس قلب نے اوسکو بالکل بیکار کر دیا ہے، اور ہمین امید
نہین کہ ہم پھر کبھی اوسکو امین آباد پارک مین ویسا ہی مترنم پائین گے۔